زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

جنوری ۲۰۲۴ء

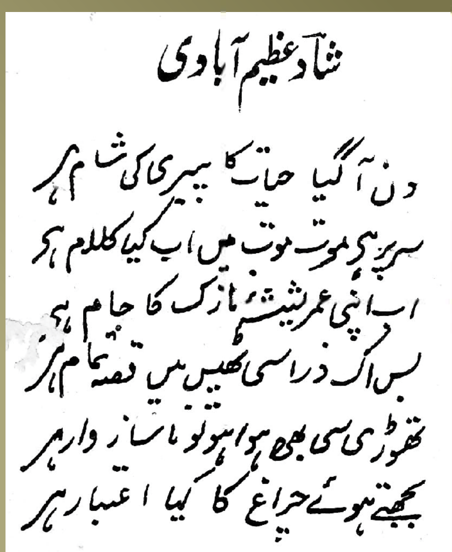
شادؔ عظیم آبادی

دن آ گیا حیات کا پیری کی شام ہے
سر پر ہے موت موت میں اب کیا کلام ہے
اب اپنی عمر شیشۂ نازک کا جام ہے
بس اک ذرا سی ٹھیس میں قصہ تمام ہے
تھوڑی سی بھی ہوا ہو تو ناساز وار ہے
بجھتے ہوئے چراغ کا کیا اعتبار ہے

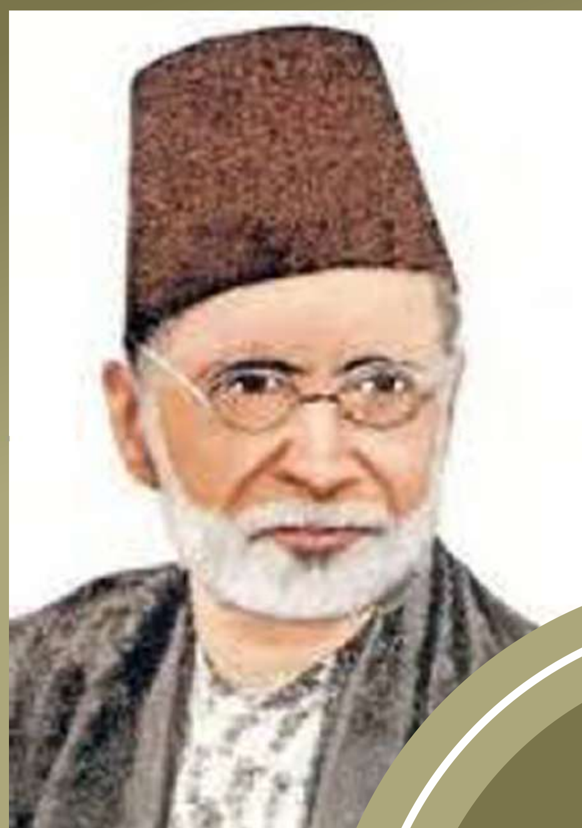

وؔلی کاکوی

غزل

چاندنی راتیں ، سرد ہوائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے
شوخ نگاہیں ، مست اَدائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے

ساغر رنگیں منھ سے لگانا ، خود پینا ہم کو بھی پلانا
ضد کہ ہمیں بھی مست بنائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے

جسم کی خوشبو بھینی بھینی ، ہار گلے میں ، ہاتھوں میں مہندی
عطر میں ڈوبی ساری فضائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے

بزم میں حاصل اُن کے نظارے، آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اشارے
پھر بھی یہ ڈر سب دیکھ نہ پائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے

وصل کی راتیں تھیں کبھی حاصل ، اب ہیں وؔلی افسانے میں داخل
اُن کو کہاں اب ڈھونڈنے جائیں ، اُف ری جوانی ہائے زمانے

وؔلی کاکوی ایک صوفی علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصل نام محمد ولی الرحمٰن اور تاریخی نام ''شاہ رضی'' ہے جس سے ۱۳۱۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ وؔلی کی تاریخ ولادت ۱۵ جنوری ۱۹۰۲ء اور جائے ولادت آبائی وطن کاکو (اُس وقت کا ضلع گیا) ہے۔ ان کے والد سید شاہ غفور الرحمٰن حمؔد کاکوی ایک صوفی منش بزرگ، اردو و فارسی کے صاحب دیوان شاعر اور بلند پایہ مورخ تھے۔ وؔلی کاکوی نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۱۴ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سیٹی میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک کے بعد ۱۹۲۱ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۲۳ء میں گریجویشن اور ۱۹۲۶ء میں بی ایل اور ایم اے کی سند لی۔ وؔلی کاکوی کی ملازمت کا زمانہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۷ء تک اور توسیع ملازمت کے بعد ۱۹۶۱ء تک ہے۔ اس دوران وہ بہار کے مختلف شہروں میں رہے اور اپنے اعلیٰ منصبی فرائض ادا کرتے رہے، پھر ملازمت سے سبکدوشی کے بعد پٹنہ ہی میں مستقل بود و باش اختیار کر لی اور یہیں فریزر روڈ پر واقع اپنی رہائش گاہ پر ۱۳ جون ۱۹۶۳ء کو آخری سانس لی اور ''باغ مجیبی'' قبرستان پھلواری شریف میں مدفون ہوئے۔ وؔلی کاکوی کے اساتذہ سخن میں والد گرامی حضرت حمؔد کاکوی کے علاوہ باقؔر عظیم آبادی اور مبارکؔ عظیم آبادی کے نام شامل ہیں اور پھر ۱۹۱۸ء وہ مبارک سال ہے جب انہیں حضرت شاؔد عظیم آبادی سے شرف تلمذ ملا۔ واضح رہے کہ وؔلی کاکوی کے دو بھائی شاہ منظور الرحمٰن اخؔتر اور شاہ عطاء الرحمٰن عطؔا کاکوی بھی شاگردان شاؔد میں ہیں۔ وؔلی کاکوی کا مجموعہ ''تجلیات وؔلی'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اس کے بعد ''برق و شفق'' کے نام سے بھی ان کا ایک اور مجموعہ چھپ چکا ہے اور وؔلی کاکوی کی زندگی اور ادبی و شعری خدمات پر ۲۰۱۵ء میں محمد مجاہد حسین کا تحقیقی مقالہ بھی کتابی صورت میں آ چکا ہے۔

BIHAR URDU ACADEMY

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۱
جنوری ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس ؍فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in
email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
ذکر شادؔ	شادؔ عظیم آبادی گلستان ہزار رنگ میں	محمد شوکت جمال	۴
	شادؔ عظیم آبادی: اپنی رباعیوں کے درپن میں	گل آفرین	۱۱
یادِ غلام سرور	غلام سرور کی ادبی خدمات	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۵
	غلام سرور: ایک مایہ ناز شخصیت	معروف عالم	۲۴
مقالات	حیرتؔ داؤدنگری: حیات وشاعری	ڈاکٹر داؤد احمد	۲۷
	فروغ فرخزاد: فارسی کی ایک انقلابی شاعرہ	ڈاکٹر احمد علی خان	۳۰
	افسانچہ نگاری کا منفرد فنکار: ایم۔اے حق	ڈاکٹر یاسمین اختر	۳۳
	چوگان ہستی اور گئودان: صنعتی انقلاب کا عظیم بیانیہ	غلام صمدانی	۳۶
	مابعد جدیدیت: ایک بیانیہ	الطاف احمد	۴۳
	بہار کے لوک گیت: چند نکات	نازنین فاطمہ	۴۶
افسانے	فطرت کا تقاضا	محمد سلیم	۵۱
	سوچ کا کرب	رئیس صدیقی	۵۳
منظومات	نعت پاک	آصفؔ احمد	۵۴
	تم زندہ ہو مجھ میں......	ڈاکٹر شبنم	۵۵
	غزلیں	فراقؔ جلال پوری / مدہوشؔ بلگرامی	۵۶
	غزلیں	شاہدؔ اختر	۵۷
	غزل	محمد شاہدؔ پٹھان	۵۸
	غزلیں	حنیفؔ نجمی	۵۹
	غزل	عمران راقمؔ	۶۰
	ہفت قطعات	مصداقؔ اعظمی	۶۱
	قطعاتِ تاریخ	سیمابؔ اکبرآبادی / صباؔ جے پوری	۶۲
کتابوں کی دنیا	افکار تاباں — ڈاکٹر تبسم فرحانہؔ	مبصر : منیرؔ سیفی	۶۳
	اردو کی برکتیں — جہانگیر انس	مبصر : ڈاکٹر ارشاد احمد	۶۵
	اکبر رضا جمشید...... — ڈاکٹر اے۔کے۔علوی	مبصر : سلطان آزاد	۶۷
سلام و پیام	شکیلؔ سہسرامی، شائستہ خاتون، محمد ارفاق، نذیر احمد یوسفی		۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ — ۸۰

''زبان وادب''، میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکر وسپاس مالک لوح وقلم کا ـــــ اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے اشاعتی سلسلہ کی چوالیسویں جلد اپنی تکمیل کو پہنچی اور اب پیش نظر شمارے سے اکادمی کا یہ مجلّہ اپنی زندگی کی ایک اور نئی بہار میں قدم رکھ رہا ہے۔ خدا کرے سالِ نو کے ساتھ یہ بہارِ نو اپنی روایت کے فروغ کی امین بنتی رہے اور حسب سابق آپ کے ذوق مطالعہ کی تسکین میں کوئی کمی نہ آئے، آمین!

جنوری کا مہینہ جن شخصیتوں کی یادیں لے کر آتا ہے، اُن میں حضرت شادؔ عظیم آبادی اور نامور صحافی جناب غلام سرور کے نام شامل ہیں، اسی مناسبت سے اِس شمارے کا آغاز ''ذکر شادؔ'' اور ''یادِ غلام سرور'' کے ساتھ ہو رہا ہے اور یہاں ایک طرف ''شادؔ عظیم آبادی گلستانِ ہزار رنگ میں'' خصوصی جدولی وتوضیحی اہتمام کے ساتھ دکھائے گئے ہیں اور ضروری نکات کے ساتھ انہیں ''اپنی رباعیوں کے درپن میں'' سامنے لایا گیا ہے تو دوسری طرف ''غلام سرور کی ادبی خدمات'' کے متنوع پہلوؤں پر غائر نظر ڈالی گئی ہے اور ''ایک مایہ ناز شخصیت'' کی حیثیت سے اُن کے امتیازی اوصاف قلم بند کئے گئے ہیں۔ بعد ازیں ''مقالات'' کے تحت ''حیرتؔ داؤدنگری: حیات وشاعری'' سے بات شروع ہوئی ہے اور ''بہار کے لوک گیت'' تک پہنچی ہے اور یہاں نہ صرف کلام حیرتؔ کا مختلف زاویے سے مطالعہ ہوا ہے بلکہ لوک گیت کی ماہیت ومعنویت اور اہمیت دکھاتے ہوئے بہار کے لوک گیت میں بول کی رنگارنگی اور دیگر خصائص کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اس حصہ میں جدید فارسی کی انقلابی شاعرہ فروغ فرخ زاد کو یاد کرتے ہوئے اُس کے کلام کا موضوعی و پیامی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں اگر ''مابعد جدیدیت: ایک بیانیہ'' کا عنوان مختلف حوالوں اور مختلف پہلوؤں کے ساتھ مبرہن ہوا ہے اور جدید صنعتی پیداواری نظام کے اثرات کی باتیں کرتے ہوئے پریم چند کے ناول ''چوگان ہستی'' اور ''گئودان'' کو صنعتی انقلاب کا عظیم بیانیہ قرار دیا گیا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ ''نئی صبح'' اور ''ڈنک'' کے فنکار ایم اے حق کی افسانچہ نگاری کے انفرادی محاسن بھی اُجاگر کئے گئے ہیں۔

مزید برآں زیر نظر شمارے میں اگر رنگوں کا استعارہ لئے ہوئے ذہن کشا کہانی ''فطرت کا تقاضہ'' کچھ خاص منفی سوچ کا منظر نامہ پیش کرتی ہے اور پروفیسر امیتابھ کے ذریعہ ایک بڑا ذہن ساز پیغام دے جاتی ہے تو خالص نفسیاتی کہانی ''سوچ کا کرب'' میں بھی اضافی آمدنی کے باوجود کمار کی ذہنی پریشانیاں اور معاشی ومعاشرتی مسائل میں گھرے ہوئے اس کے حلقہ احباب کی الجھنیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اس شمارے کے مقالے اور افسانے ہی متوجہ نہیں کریں گے بلکہ منظوماتی اوراق اور ''کتابوں کی دنیا'' بھی جالب توجہ ہوگی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اُنہیں نہ صرف خوش کام بنائے گا بلکہ خوش گام بننے کا ذہن بھی دے گا۔ انہیں سطروں کے ساتھ ''سالِ نو اور یوم جمہوریہ مبارک'' کہتے ہوئے اور آپ کے زریں خیالات وتاثرات کا شبانہ یوم انتظار رکھتے ہوئے خدا حافظ!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

ذکر شادؔ

محمد شوکت جمال
Sabzibagh, Patna - 800004

شادؔ عظیم آبادی گلستان ہزار رنگ میں

''شادؔ: خان بہادر سید علی محمد، وطن عظیم آباد۔ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، وصال ۱۹۲۷ء۔ میر محمد لکھنوی اور حاجی محمد رضا شیرازی اُن کے استاد تھے۔ فریادؔ عظیم آبادی سے بھی تلمذ تھا۔''

درج بالا سطریں جس کتاب کے صفحہ ۵۲۵ وصفحہ ۵۲۶ سے لی گئی ہیں، اُس کتاب کا نام ہے ''گلستان ہزار رنگ'' ——— اس کتاب کی ''تمہید'' میں اس کے مؤلف سید بہاء الدین احمد نے مختلف ادوار کے مشہور شعرا کا کلام پیش کرتے ہوئے شادؔ عظیم آبادی کا یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

یہ بزمِ مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اور پھر کتاب کے صفحہ ۵۰۰ پر بھی ''کوتاہ دستی'' کے ذیل میں یہ شعر آیا ہے۔

سید بہاء الدین احمد نے اپنے بارے میں اس کتاب کے صفحہ ۵۳۶ پر درج ذیل سطریں لکھا ہے:

''سید بہاء الدین احمد: مؤلف کتاب۔ ولادت ۱۹۱۱ء وطن پہلے نیانواں، ضلع گیا (بہار) تھا، اب محلّہ دریاپور پٹنہ ہے۔ حکومت بہار میں پہلے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج تھا، اب بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر ہے۔''

سید بہاء الدین احمد کی یہ کتاب دوسری بار مارچ ۱۹۷۱ء میں چھپی تھی اور مذکورہ عبارت سے ظاہر ہے کہ اُس وقت وہ ڈسٹرکٹ سیشن جج کے عہدہ سے فارغ ہو چکے تھے اور بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے ''انتخاب اشعار بقید عنوان'' کی صورت میں اپنے کام کا آغاز ۱۹۴۳ء سے کیا تھا اور پھر اس کتاب کے طبع ثانی کا دیباچہ انہوں نے اپریل ۱۹۶۸ء لکھا۔ اِس وقت مذکورہ کتاب کی رائل سائز (یعنی سوا چھ انچ اور سوا نو انچ کی تقطیع) کے ۵۳۶ صفحات پر مشتمل یہی دوسری اشاعت میرے مطالعہ کی میز پر ہے جس کا ''مقدمہ'' مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے۔

مولانا نیاز فتح پوری کے لفظوں میں سید بہاء الدین احمد کی یہ کتاب ''تاریخ، تذکرے اور انتخاب کلام کا بڑا دلچسپ آمیزہ ہے۔'' اس کتاب میں چھ سو پندرہ شاعروں کے جو اشعار یکجا کئے گئے ہیں، ان کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق کئی ہزار تک پہنچ رہی ہے۔

یہاں مولف نے چالیس بنیادی عنوان قائم کرنے کے بعد اُن کے تحت متعدد ذیلی عنوانات کا اہتمام کیا ہے جن کی مجموعی تعداد چھ سو چوبیس ہے اور پھر سبھی عنوانات پر اشعار جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب اصل میں ایک قاموسی نوعیت کا شعری انتخاب نامہ ہے جس میں ہر طرح کے مطالب و مضامین کے عنوان تجویز کر کے ہر عنوان کے تحت مناسب اور چنے ہوئے اشعار، شاعر کے نام کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں۔

یہاں ہمارا اصل موضوع اس کتاب کا تجزیہ نہیں، بلکہ محض تمہیدی طور پر اس کتاب کا مختصر سا تعارف لکھنے کے بعد ہم اُس رُخ کی طرف آنا چاہتے ہیں جو حضرت شادؔ عظیم آبادی کے اشعار کی شمولیت سے اپنا رشتہ رکھتا ہے۔

اس مضمون کے ساتھ ایک طویل جدول دی جا رہی ہے جو بہت ساری بنیادی معلومات سمیٹے ہوئے ہے، اس جدول پر ایک نظر ڈالنے سے بہت ہی آسانی کے ساتھ یہ بات سامنے آسکتی ہے کہ اس کتاب کے چالیس بنیادی عناوین میں سے

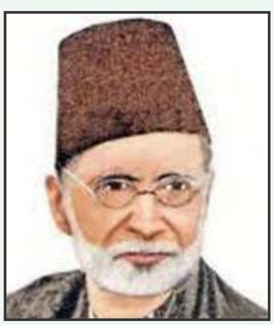

چھبیس عناوین کے تحت اور چھ سو چوبیس ذیلی عناوین میں سے ترسٹھ عناوین پر حضرت شادؔ عظیم آبادی کے پچھتر اشعار شامل کئے گئے ہیں۔ یہ خاص بات ہے کہ بعض ذیلی عنوان مثلاً ''شرافت'' کے تحت صرف حضرت شادؔ کے شعر پر اکتفا ہوا ہے تو ''اظہارِ حال'' اور ''نگاہ ساقی'' جیسے بعض ذیلی عنوان کے تحت حضرت شادؔ کے دو دو، تین تین اشعار جمع کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح بعض بنیادی عنوان مثلاً ''مے ومیکدہ''، ''کوئے یار وآستانہ'' اور ''متفرقات'' کے تحت متعدد ذیلی عناوین پر شادؔ کے اشعار انتخاب میں آ گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ''مے ومیکدہ'' والے اشعار کی ہے۔ یہاں مذکورہ کتاب کے حوالے سے ہمیں اعداد وشمار کی تفصیلوں میں جانا مقصود نہیں، اس لئے کہ مشمولہ جدول سے یہ ضرورت بہ آسانی تمام پوری ہوسکتی ہے، البتہ اپنی گفتگو اس رُخ پر لاتے ہوئے ہم یہ ضرور دکھانا چاہتے ہیں کہ کسی بھی انتخابی نوعیت کے کام کا کمزور پہلو اپنی جگہ، مگر اس سے بعض خصوصی جہتوں کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔

حضرت شادؔ عظیم آبادی یقیناً ایک شاعر نہیں، نابغہ روزگار شاعر تھے اور ''گلستانِ ہزار رنگ'' میں دوہری موضوعاتی قید کے ساتھ اُن کے اشعار کی یکجائی اس دعوے کی مزید عملاً توثیق کر دیتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعاتی تنوع اور پھر ایک ہی موضوع و مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کے وافر ثبوت موجود ہیں۔

''گلستانِ ہزار رنگ'' میں شامل حضرت شادؔ کے اشعار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو صرف اتنا ہی اندازہ نہیں ہوتا کہ ان میں ابیات مشہورہ اور مطلع و مقطع کے علاوہ اُن کے کم معروف اشعار بھی ہیں

اشعارِ شادؔ بہ کتاب گلستان ہزار رنگ

حمد		جس سے تیرا بیان سنتے ہیں ☆ نت نئی داستان سنتے ہیں	ص ۵۷
		میں درِ حرم کے شگاف سے تجھے جھانک لوں یہی تھی ہوس	
		یہ نہیں تو پھر درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی	ص ۵۷
آفرینش	ہستی ونیستی	سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی ☆ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم	ص ۶۹
تلاش وجستجو	سفر	سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں ☆ مزہ تو یہ ہے، نہ منزل نہ راستہ معلوم	ص ۸۳
جنوں وخرد	زنداں کا اسیر اور	اسیر جسم ہوں معیادِ قید لامعلوم	
	ذوق اسیری	یہ کس گناہ کی سزا ہے خدا معلوم	ص ۱۱۴
سراپائے محبوب	آنکھیں	وہ چشم مست وہ ترچھی نظر معاذ اللہ ☆ حیا ہزار بھری ہے مگر معاذ اللہ	ص ۱۱۸
سامان آرائش	آرائش	دیدنی تھا یہ سماں تیرے نکھرنے کی قسم ☆ سکتہ آئینے کا، جلوہ ترا، حیرت میری	ص ۱۳۰
	پیرہن و	بسا ہوا ہے ترے پیرہن سے اپنا دماغ	
	بوئے پیرہن	ہزار پھولوں کو سونگھا کسی میں بو ہی نہیں	ص ۱۳۲
شوخی وادا وناز	انگڑائی	وہ اُس کی جھوم کے انگڑائیاں خدا کی پناہ ☆ وہ چشم مست کی ترچھی سناں خدا کی پناہ	ص ۱۳۹
	بدگمانی	کہیں جواب ہے اس حد کی بدگمانی کا ☆ کہ شکر بھی جو کروں آپ اسے گلہ کہئے	ص ۱۳۹
	برہمی وعتاب	عرض مطلب پہ براماں کے غصہ کیسا ☆ شادؔ دیوانہ بھی تیرا ہے گدا بھی تیرا	ص ۱۴۱

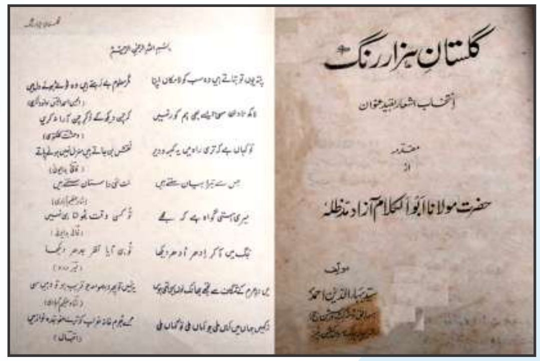

اور بعض ایسے اشعار بھی جو صنائع وبدائع کے لحاظ سے مختلف نوعیت کی مثالیں سامنے لا دیتے ہیں اور یہ کہنا تو یقینی طور پر داخل انکشاف نہیں ہوگا کہ محض یہ اشعار ہی سامنے رہیں تو شاؔد کے اسلوب سخن کی بیشتر خوبیاں نہایت آسانی سے آئینہ ہوسکتی ہیں۔

جہاں تک موضوعات اور بیانات کا تعلق ہے،ان اشعار پر بالاستیعاب نگاہ ڈالی جائے تو یہ سمجھنے میں چنداں دشواری کا امکان نہیں کہ شاؔد نے حمد الٰہی کے تعلق سے ''کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ'' (سورہ رحمٰن آیت ۲۹) کا مضمون سہل ممتنع کے انداز میں بخوبی تمام باندھا ہے۔ بیشک انسان آئے دن قدرت کے نت نئے نظارے دیکھتا بھی ہے اور کسی نہ کسی پیرائے میں اپنے ہم جلیسوں سے اس کا ذکر بھی کرتا ہے، پھر یہ کہ شاؔد نے دیرِ حرم نہ سہی درصومعہ سے ہی تجلی الٰہی دیکھنے کی آرزو کا اظہار نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔ وہ عہد فرنگی کے شاعر ہیں اور اس جہت سے دیر کی بجائے ''درِصومعہ'' کی استعاراتی تہہ داری کا مزید احساس ہوتا ہے۔

وجود وعدم کا فلسفہ ہو یا تلاش وجستجو کا معاملہ، اس موضوع پر بھی تضاد اور مناسبات لفظی کے ساتھ شاؔد نے بہت عمدگی سے اپنے خیالات کو شعری جامہ عطا کیا ہے اور جسم و روح کا رشتہ بھی قید و بند کے حوالے سے استعارے کی زبان میں بحسن تمام سامنے لا دیا ہے۔

شاؔد کے ان غزلیہ اشعار میں محبوب کی ترچھی، مگر حیا بھری نگاہیں بھی ہیں، اس کی آرائش وزیبائش اور اس کے حسن ونکھار کی کیفیت

	خوئے دوست	دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم ☆ آسماں بدلا، زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست	ص	۱۵۰
شباب وپیری	ضعیفی، پیری	یا بڑھاپا ہے یا جوانی تھی ☆ عمر دو بول کی کہانی تھی	ص	۱۶۵
	عمر رفتہ	شاؔد نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ نشہ کی مستی		
		تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے	ص	۱۶۶
	یادِ شباب	کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی ☆ پہلے ہم دیر تلک بیٹھ کے رو لیتے ہیں	ص	۱۶۷
شوقِ دیدودیدار	جلوہ گری دوست	وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا		
		خدا جانے اُن آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا	ص	۱۶۸
	جمال دوست	دیکھا تو ہم نے ازل میں جمال دوست ☆ لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا	ص	۱۷۰
	نام محبوب	اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا		
		تو میں مرنے سے باز آیا، مرے کس کام آئے گا	ص	۱۷۹
عشق وعاشقی	رسوائی عاشق	رسوائیاں غضب کی ہوئیں ان کی راہ میں ☆ حد ہے کہ خود ذلیل ہوں اپنی نگاہ میں	ص	۲۰۶
عرض مدعا،تمنا	اظہارِ حال	بھرے ہوں آنکھ میں آنسو خمیدہ گردن ہو ☆ تو خاموشی کو بھی اظہار مدعا کہئے	ص	۲۲۵
		شب کو مری چشم حسرت کا، سب دُکھ درد اُن سے کہہ جانا		
		دانتوں میں دبا کے ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا	ص	۲۲۵

بھی اور پھر اس کے لباس معطر کا تذکرہ بھی۔ یہاں محبوب کی انگڑائیوں کا منظر بھی ہے اور اس کی بدگمانی و برہمی اور اس کی دائمی عادت وخصلت کا مبالغت بداماں بیان بھی۔ ان اشعار میں پیکر تراشی اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کا ہنر بھی حد درجہ دیدنی ہے۔

شآد نے شباب اور پیری کو ''عمر کے دو بول کی کہانی'' بتایا ہے اور عمر رفتہ اور یادشباب سے اپنے اشعار کی ترصیع کی ہے۔ یہاں صرف شوق دید و دیدار کے حوالے سے محبوب کی جلوہ گری، اس کے حسن و جمال اور اس کے نام نامی پر ہی شاعر کے بیانات ہمارے سامنے نہیں آتے ہیں، بلکہ عاشق کی رسوائی اور عرض تمنا میں اس کے اظہار حال کی مختلف کیفیتیں بھی اجاگر ہو جاتی ہیں اور ذرا سا ٹھہر کر دیکھیں تو یقیناً ان اشعار میں تعلیق کا استعمال، محاورہ کی بندش کا حسن اور محاکاتی و تکلمی انداز بھی چھپا نہیں رہ سکتا۔

فراق و وصل کا ظہور مختلف مراحل میں ہوتا ہے اور محبوب کے انتظار، اس کی آمد، اس کے پیام اور پھر اس کے وداع ہو جانے پر عاشق کے دل سے نکلنے والی آہِ بے اختیار، غرض کہ ہر ایک مراحل کا بیان اپنے خاص جذباتی انداز و الفاظ میں شآد کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے اور فغان و فریاد کو اشعار کی

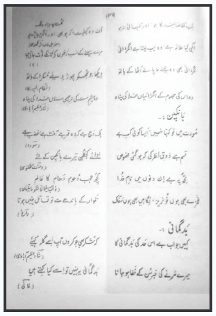

کمان و کمند کا اسیر بنائے جانے کی ہنرمندی بھی بہر صورت شآد کی غزلیہ شاعری میں نکھر کر سامنے آتی چلی جاتی ہے۔

شآد عظیم آبادی کی شاعری میں عاشق کی حسرت شہادت

		خبر کیا غیب کی غم خوار کو اور یاں یہ عالم ہے ☆ کہا جاتا نہیں اپنی زباں سے حال زار اپنا	ص	۲۲۶
	جواب	پلٹ کے دیکھ تو لیتا اگر جواب نہ تھا ☆ حیا سے گڑ گئے تجھ کو پکارنے والے	ص	۲۲۸
	دعا	پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ، ناک رگڑنی ، سجدے پہ سجدے		
		جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے	ص	۲۳۲
فراق ووصل	آمد یار	شب فراق کی آمد ہی تھی کہ تو پہنچا ☆ ترے نثار کہ آئی بلا کو ٹال دیا	ص	۲۴۲
	انتظار	نہ رات کٹتی ہے کم بخت امیدواروں کی ☆ نہ دل کو حوصلہ انتظار باقی ہے	ص	۲۴۴
	پیغام وپیغامبر	الجھ نہ ہم سے تو، قاصد کو ہم نے کیا اے دل ☆ سکھا دیا تھا کہ جانا تو جا کے رہ جانا	ص	۲۴۷
	وداع یار	یوں نہ ویران کر کے جا ظالم ☆ کچھ تو کر شرم دل میں آنے کی	ص	۲۶۵
فغان وفریاد	آہ	ہجوم ضعف میں لینا تھا صبر سے کچھ کام ☆ خود اپنی آہ کی ٹھوکر سے دل نے کھائی چوٹ	ص	۲۷۵
		کہانیاں اثر آہ کی غلط ہیں شآد ☆ کسی کے دل پہ کسے اختیار ہوتا ہے	ص	۲۷۶
قتل	حسرت شہادت	صف آخر میں ہوں میں وا اصفا اے قاتل ☆ خوف یہ ہے کہ تھکا جاتا ہے باز و تیرا	ص	۲۸۹
	شہیدان وفاوناز	شہید ناز کی بھولی نہیں ہمیں صورت ☆ تری طرف کو نگاہیں پھرا کے رہ جانا	ص	۲۹۲
کوئے یارو	آسودگان	محو ہیں اپنی جگہ آسودگان کوئے دوست		
آستانہ	کوئے دوست	آرزو دل میں ہے ، دل آنکھوں میں ، آنکھیں سوئے دوست	ص	۲۹۴
	سجدے	زاہد سمجھ نہ کبر جو ہم چپ کھڑے رہے ☆ اس آستاں کے سجدے کے قابل یہ سر نہ تھا	ص	۲۹۶
	کوئے یار	گلی میں یار کی اے شآد سب مشتاق بیٹھے ہیں		
		خدا جانے وہاں سے حکم کس کے نام آئے گا	ص	۲۹۷

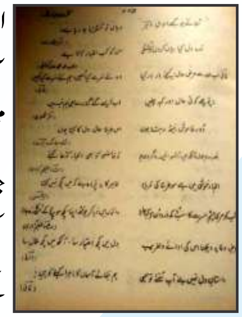

اورشہیدان وفا کا تذکرہ بھی مضمون آفرینی کی شان کے ساتھ ہوا ہے اور پھر محبوب کی گلی اور محبوب کی چوکھٹ، اس پر جبہ سائی اور اس گلی تک بار پا لینے والوں کی اندرونی کیفیت بھی مرحلہ وار، شادؔ کے یہاں بیان ہوگئی ہے۔ یہاں شادؔ نے جس انداز سے آستانِ محبوب کا مرتبہ دکھایا ہے اور جن خدشات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی بہت ہی لطافت اور مبالغت بداماں ہے۔ مجبوری و بے بسی کا عالم کیا ہوتا ہے، ناز و نیاز کی کیفیت کیا ہوتی ہے، یہ بھی شادؔ کے یہاں مشہود ہے اور یہ بھی کہ بلبلہ، بلبلہ سہی، مگر اس کی اہمیت کیا ہے۔

شادؔ کے نزدیک زندگی، اصل میں جینے کا انداز پا لینے کا دوسرا نام ہے۔ بہ الفاظ دیگر زندگی، آداب زندگی کے شعور سے عبارت ہے۔ تھکن کی رات ہو یا ملن کی رات، اس کا حال اس تجربے سے گزرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ گردش لیل و نہار سے چاہے صبح و مسا کا وقت بدل رہا ہو، چاہے بہار و خزاں کا موسم آ رہا ہو اور جا رہا ہو، بہر کیف اس کی معنویت، محبوب سے اس کی یک گونہ نسبت اور اس کے ہمہ صورت اثرات میں ہی پنہاں ہے۔

یہاں شاعر نے غنچہ و گل کے استعارے میں جو آفاقی صداقتیں بیان کی ہیں اور حیات مستعار کا جو نقشہ کھینچا ہے یا یہ کہا جائے کہ بے ثباتی عالم کا جو فلسفہ نظم کیا ہے، وہ خوبصورت ہی نہیں بلکہ لفظوں کے تخلیقی و تہدار استعمال پر بھی شاہد ہے۔ ان اشعار کے مضامین چاہے ''گل و فصل'' اور ''محفل یار'' کے تحت ہوں یا ''امید و یاس'' کے تحت،

کیفیات و واردات	مجبوری	غضب ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا زمیں کا سخت ہونا ، آسماں کا دور ہو جانا	ص ۳۱۳
ناز و نیاز		یہ سب درست کہ تم بت بھی ہو خدا بھی ہو ☆ مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو	ص ۳۱۸
کشتی و طوفاں	حباب	یوں حبابوں کا نہ دل توڑ خدارا اے موج انہیں قطروں کی بدولت تو ہے دریا تیرا	ص ۳۲۱
گردش آسماں و زندگی		اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا	ص ۳۳۰
لیل و نہار	شب	لپٹ وہ زلفوں کی جاں بخش اور وہ پیاری رات بسر ہوئی کبھی ایسی بھی ساری ساری رات	ص ۳۳۴
		کچھ وہی اُس کو سمجھتا ہے کہ شب کیوں کر کٹی ☆ تھک کے رستے میں جو اے شامِ غریباں رہ گیا	ص ۳۳۴
گل و فصل گل	بہار	ہم اور سیر لالہ و گل ہجر یار میں ☆ کیسی بہار ، آگ لگا دوں بہار میں	ص ۳۴۴
	خزاں	ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ، ابھی سے وحشت برس رہی ہے ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آسماں رہے گی	ص ۳۴۶
	غنچہ	یہاں نہ نشو و نما کا حاصل ، نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا ہنسو گے تم اس چمن پہ غنچو ، زمانہ آلے ذرا نمو کا	ص ۳۴۹
	گل و آتش گل	غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول ☆ اپنا کرو خیال ہماری تو کٹ گئی	ص ۳۵۱
		بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل ☆ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا	ص ۳۵۲

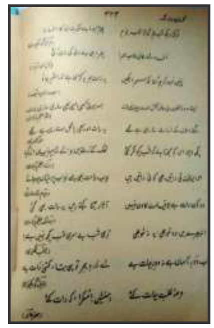

بہرکیف میؔر و ذوقؔ جیسے شاعروں کے ابیات معروفہ یاد دلا جاتے ہیں، مگر اس حسن تفاوت کے ساتھ کہ شادؔ کے کہنے کا انداز، بالکل ان کا اپنا انداز ہے اور شاید اسی لئے ایسے بیشتر اشعار زباں زد خاص و عام بھی ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اشعار شادؔ کی جو جدول سامنے رکھ کر باتیں ہو رہی ہیں اس میں ''جنوں وخرد'' کے تحت ''زنداں کا اسیر اور ذوق اسیری'' اور پھر ''مشت پر (بلبل) وصیاد'' کے تحت ''اسیری و ذوق اسیری'' والا شعر مکرر آ گیا ہے، لیکن اس سے قطع نظر، اس جدول کے بموجب ''برق وخرمن'' اور ''صید وصیاد'' کے تعلق سے شادؔ کے شعر کا طنطنہ اور اس میں خودسپردگی یا ایک قسم کے طنز ملیح کا انداز بہرحال متوجہ کر لیتا ہے۔

شادؔ نے اپنے غزلیہ اشعار میں جس انداز سے دوستوں کی شکایت کی ہے اور محفل احباب کو جس طرح غنیمت بتایا اور اس کے اٹھتے چلے جانے کا حال دکھایا ہے اور پھر جس طرح ''ایک چادر کو ترستی'' اپنی تربت کا ذکر لایا ہے، بھری محفل سے اُٹھوائے جانے اور کفن سے منہ

ڈھکے ہونے کی باتیں کی ہیں اور موت کو رستگاریٔ آلام کا ذریعہ بتایا ہے، وہ بھی شادؔ ہی کا حصہ ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شادؔ کی غزلوں میں خمریاتی مضامین طرح طرح سے بیان ہوئے ہیں اور خیر سے ''گلستان ہزار رنگ'' سے

محفل یار	بزم	دلِ مضطر سے پوچھ اے رونق بزم ☆ میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں	ص ۳۶۳
مدعا، امید و یاس	آرزو وتمنا	تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں ☆ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں	ص ۳۷۰
	مدعا	اے دل مدعا طلب وقت سوال بھی تو ہو ☆ ہم کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا	ص ۳۷۶
مشت پر وصیاد	اسیری وذوق اسیری	اسیر جسم ہوں میعاد قید لامعلوم ☆ یہ کس گناہ کی تعزیر ہے خدا معلوم	ص ۳۸۳
	برق وخرمن	بتایئے مرے خرمن نے کیا بگاڑا ہے ☆ فلک پہ برق جو رہ رہ کے تلملاتی ہے	ص ۳۸۹
	صید وصیاد	بہ شوق دام میں لا کر قفس میں بند کرے ☆ خوشا وہ صید کہ صیاد خود پسند کرے	ص ۳۹۱
ملاقات	گلہ احباب	اے شادؔ جن کے ساتھ زمانہ بسر کیا ☆ اللہ اب وہی مجھے پہچانتے نہیں	ص ۴۰۹
	لطف صحبت	بہت مشکل ہے چند احباب کا یکجا بہم ہونا	
		بہ حسرت دیکھ لو اِک اِک کو اُٹھتی انجمن والو	ص ۴۱۰
موت وبیماری	تربت	پردہ پوشانِ وطن تم سے تو یہ بھی نہ ہوا ☆ ایک چادر کو ترستی رہی تربت میری	ص ۴۱۵
	کفن	لحد میں کیوں نہ جاؤں منھ چھپائے ☆ بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں	ص ۴۲۴
	موت	اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو ☆ موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو	ص ۴۲۷
مے ومیکدہ	پیمانہ	جلو میں پیر مغاں سا رہبر، بغل میں ساقی سا مہر گستر	
		بڑے تکلف سے آیا ساغر، بڑے تجمل سے جام نکلا	ص ۴۳۰
		زمیں پہ جام کو رکھ دے ذرا ٹھہر ساقی ☆ میں اس پہ ہولوں تصدق، تو پھر اُٹھا کے پیئوں	ص ۴۳۱
	رندی ومستی	ستم زاہد پیمان شکن سے نہیں کم ☆ ایسی مستی کہ جو غارت گر میخانہ بنے	ص ۴۳۶
	زاہد	جناں میں ہے زاہد، ترے در پہ ہم ہیں ☆ محل اپنا اپنا، مقام اپنا اپنا	ص ۴۳۷

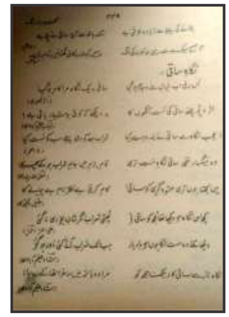

ماخوذ اس مشمولہ جدول کے آخری حصہ میں ایک دو نہیں، بارہ اشعار ''مے اور میکدے'' کے تعلق سے جمع ہیں جن میں رندی و مستی، زاہد، شراب، لغزش رفتار، مے نوشی اور نگاہ ساقی کی باتیں آئی ہیں اور جب تک شراب آئے، گویا مست نگاہوں کے صدقے کئی دور ہو گئے ہیں۔ مزید لطف یہ ہے کہ ان اشعار میں ذہن ساز اور انتہائی لطیف جذباتی و نفسیاتی نکتے بھی پنہاں ہیں، پھر ''متفرقات'' کے تحت جو اشعار جمع ہوئے ہیں، ان میں جیسا کہ قبل بھی ذکر ہوا، خاص بات یہ ہے کہ ''شرافت'' کے تعلق سے صرف شادؔ کا ہی ایک شعر آیا ہے جس میں صنعت استدلال کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ کسی سے الجھنا، شریفوں کی شرافت پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ یہاں ''تحیر'' کے حوالے سے شادؔ کا شعر حوصلہ دلاتا اور پھر ''تو اور میں'' کا مضمون گئے وقت کا تاسف دکھاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ''افسانہ'' درد کی نئی اور پر اثر ترکیب کا اشارہ دیتے ہوئے، عزم و حوصلہ اور بروقت اقدام کے باب میں اس پیامی فلسفہ تک پہنچتا ہے کہ کوتاہ دستی وجہ محرومی ہے۔

غرض کہ ''گلستان ہزار رنگ'' نامی اس تالیف میں جمع ہو جانے والے یہ اشعار حسن اتفاق سے حضرت شادؔ عظیم آبادی کی غزلیہ شاعری کے بیشتر فکری و فنی اور منفرد اسلوبیاتی خصائص کی آئینہ داری میں از بس کامیاب ہیں۔ ❁❁

	شراب	ہزار تلخ ہے پیر مغاں نے جب دی ہے ☆ خدا نہ کردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں	ص	۴۳۹
	لغزشِ رفتار	میں فدا لغزشِ رفتار پہ اپنی اے شادؔ ☆ دور سے دیکھ کے اس نے مجھے پہچان لیا	ص	۴۴۴
		قدم اُٹھا کے مرا تلملا کے رہ جانا ☆ جھکا کے سر کو ترا مسکرا کے رہ جانا	ص	۴۴۴
	مےنوشی	میکدہ ہے یہ، سمجھ بوجھ کے پینا اے رند ☆ کوئی گرتے ہوئے پکڑے گا نہ بازو تیرا	ص	۴۴۷
		مغبچے ہیں متحیر، متبسم ساقی ☆ پینے والے تجھے پینے کا نہ انداز آیا	ص	۴۴۸
	نگاہِ ساقی	دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار ☆ جب تک شراب آئے، کئی دور ہوگئے	ص	۴۴۹
		نگاہِ ناز سے ساقی کا دیکھنا مجھ کو ☆ مرا وہ ہاتھ میں ساغر اُٹھا کے رہ جانا	ص	۴۴۹
		ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ ☆ مشکل سنبھالنا ہے دل بیقرار کا	ص	۴۵۰
متفرقات	تحیر	میں حیرت و حسرت کا مرا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم	ص	۴۷۷
	تو اور میں	نہ مشتاقوں کا مجمع تھا، نہ جانبازوں کا میلہ تھا ☆ خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب تو اکیلا تھا	ص	۴۸۱
	شرافت	گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر سوا خموشی کے دم نہ مارا شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی	ص	۴۸۹
	فسانہ	کہتے ہیں اہل ہوش جب افسانہ آپ کا ☆ ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا	ص	۴۹۴
		ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار ☆ اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا	ص	۴۹۵
	کوتاہِ دستی	یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے	ص	۵۰۰

❁❁❁

گل آفرین
Chandwara, Muzaffarpur (Mob.9801203176)

شادؔ عظیم آبادی: اپنی رباعیوں کے درپن میں

اردو شاعری صدیوں پر محیط ہے اور شاید یہ بات بھی اُس کے لئے داخل اوصاف ہی سمجھی جائے گی کہ اُس میں ہم تخلص مشاہیر شعرا کی تعداد ہمیشہ ہی نمایاں رہی ہے اور لطف بالائے لطف یہ بھی کہ اُن معروف زمانہ شاعروں میں بہار کے ارباب سخن بھی شامل رہے ہیں، مثلاً محمد حسین آزادؔ اور جگن ناتھ آزادؔ ہیں تو فضل حق آزادؔ عظیم آبادی بھی، میر محمد اثرؔ دہلوی اور جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی ہیں تو نواب سید امداد امام اثرؔ عظیم آبادی بھی، واجد علی شاہ اخترؔ، اخترؔ شیرانی، جاں نثار اخترؔ اور پنڈت ہری چند اخترؔ ہیں تو اخترؔ اورینوی اور اخترؔ قادری بھی، اکبرؔ الہ آبادی ہیں تو حضرت اکبرؔ داناپوری بھی، ضیاؔ فتح آبادی ہیں تو ضیاؔ عظیم آبادی بھی، قتیلؔ شفائی ہیں تو قتیلؔ داناپوری بھی، میلا رام وفاؔ ہیں تو وفاؔ ملک پوری بھی اور ولیؔ دکنی ہیں تو ولیؔ کاکوی بھی اور اسی طرح مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، شادؔ عارفی اور نریش کمار شادؔ ہیں تو سید علی محمد شادؔ عظیم آبادی بھی اور درحقیقت اِس مضمون میں ہمیں فی الوقت حضرت شادؔ ہی کو ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے یاد کرنا مطلوب ہے۔

شادؔ عظیم آبادی ۱۸۸۶ء میں اس عالم رنگ وبو میں آئے اور تقریباً ۸۱ سال عمر پاکر اس جہاں سے رخصت ہوگئے، لیکن بھلا کون جانتا تھا کہ سید عباس مرزا کے گھر پورب دروازہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہونے والا وہ بچہ جس نے محض سات آٹھ سال کی عمر میں یا یوں کہیں کہ ۱۸۵۴ء کے آس پاس کہا تھا۔

جو کوئی اس تلنگی کو لوٹے
سنگ آفت سے اس کا سر پھوٹے

وہ میر سید محمد لکھنوی، حاجی محمد رضا شیرازی اور شاہ الفت حسین فریادؔ کی شاگردی وتربیت، اپنے شوق وصلاحیت اور اپنی نہایت ہی اچھی تعلیم کی بدولت اس مقام تک پہنچے گا کہ اُسے اپنے وقت کا میرؔ سمجھا جائے گا، پینتالیس سال کی عمر میں وہ ''خان بہادر'' کا خطاب پائے گا، بتیس سال تک آنریری مجسٹریٹ کے منصب پر رہ کر ہمیشہ اردو میں فیصلہ لکھا کرے گا اور دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے اس کا مرتبہ زمانے میں مسلم ہوگا، وقت کے ایک عظیم مصنف، ماہر لسانیات اور رباعی کے تعلق سے ''خیام'' جیسی کتاب لکھنے والے سید سلیمان ندوی کا قلم نہ صرف اُسے میرؔ عصر کہے گا بلکہ یہ وضاحت بھی کردے گا کہ شادؔ کے یہاں وہی انداز بیان، سوز وگداز، الم وفریاد، حسرت ویاس، درد وغم ہے جو میرؔ کی شاعری کا خاصہ ہے۔

اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ شادؔ عظیم آبادی نے غزل کے میدان میں اپنی طبع رسا اور فکر رسا کے خاص جوہر دکھائے ہیں اور اپنی نظریاتی کاوشوں کی بدولت جہانِ مراثی میں جدید مرثیہ کے بانی قرار پائے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک واضح حقیقت یہ بھی ہے کہ حضرت شادؔ نہ صرف عربی، فارسی انگریزی اور دیگر علوم متداولہ سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، بلکہ اسلامیات کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے عہد نامہ جات عتیق و جدید، پارسیوں کی ژند پاژند اور ہندوؤں کی رامائن اور گیتا کا بھی انہوں نے سیر حاصل مطالعہ کر رکھا تھا اور ان تمام باتوں پر مستزاد یہ بھی کہ وہ بحیثیت شاعر زمانے میں درجہ استناد پانے کے لئے قرار واقعی کاوشوں کا بھی پورا پورا شعور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فریادؔ سے تلمذ پانے کے بعد انہوں نے صرف اسی بات کو کافی نہیں سمجھا کہ اس طرح اُن کا سلسلہ سخن، اپنے استاد کے حوالے سے شاگردانِ میر دردؔ تک پہنچ رہا ہے بلکہ انہوں نے اپنے زمانے کے مزاج کی بھی ہر طرح پاسداری کی۔

شادؔ نے جو زمانہ پایا تھا اس زمانے میں ایک شاعر کو بذاتِ خود استادانہ مرتبہ تک پہنچنے کے لئے تین باتیں لازمی سمجھی جاتی تھیں، پہلی

بات تو یہ کہ وہ فن عروض میں کامل دستگاہ رکھتا ہو، دوسری بات یہ کہ اس کے شاگرد کثیر تعداد میں ہوں اور تیسری بات یہ کہ وہ قادر الکلام شاعر ہو، یعنی بیشتر موضوعی اور ہیئت پر مبنی اصناف سخن میں طبع آزمائی کر رہا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاؔد کے یہاں عروضی مہارتوں کے شواہد بالکل ہی عیاں ہیں اور جہاں تک بڑی تعداد میں اور نہایت کامیاب اور نامور شاگرد بنانے کی بات ہے تو اس کی تفصیلیں بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں اور رہی بات متنوع اصناف میں طبع آزمائی کی، تو یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ شاؔد نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھیں، مراثی بھی کہے، مثنویاں بھی لکھیں، قطعات بھی کہے اور رباعیاں بھی لکھیں۔ دیگر اصناف میں شاؔد کی باقیات سے قطع نظر، جہاں تک ان کی رباعیوں کا تعلق ہے، وہ نہ صرف کمیت کے لحاظ سے تین ہندسوں میں پہنچتی ہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار بھی وہ بہت ہی سرسبز وشاداب ہیں۔

شاؔد کی رباعیوں میں فلسفیانہ، صوفیانہ، رندانہ وحکیمانہ، اخلاقی وعاشقانہ اور پیری وشباب وغیرہ، غرض کہ متنوع موضوعات کا ایک جہاں آباد ہے۔ ''رباعیات شاؔد'' کے نام سے ان کے شاگرد رشید حمیؔد عظیم آبادی نے ۱۹۴۵ء میں نواب سر نظامت جنگ بہادر، حیدرآباد دکن کے منظوم انگریزی ترجمہ کے ساتھ جو کتاب منظر عام پر لائی تھی اس میں پنچانوے رباعیاں ہیں اور ان کے علاوہ شاؔد کی دیگر رباعیاں بھی ملتی ہیں جو ''کلیات شاؔد'' مرتبہ کلیم الدین احمد اور ''باقیات شاؔد'' مرتبہ نقی احمد ارشاد میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس طرح شاؔد کی رباعیاں تعداد میں دوسو سے تجاوز کر جاتی ہیں۔

یہاں یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ شاؔد کی رباعیوں کو ایسی مقبولیت کے درجہ تک پہنچنے کے اسباب کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب پانے کے لئے اردو میں رباعی گوئی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ تو مسلم ہے کہ رباعی اردو شاعری کی اگرچہ ایک قدیم وعظیم صنف ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فنی حیثیت سے اس صنف کو قدیم زمانے میں کم کم ہی مقبولیت ملی، بہرکیف دردؔ، سوداؔ، میرؔ، آتشؔ، ناسخؔ، انشاؔء، جرأتؔ نے رباعی گوئی سے شغف رکھا، پھر غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور انیسؔ ودبیرؔ کا زمانہ آیا اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ رباعی ان مشاہیر سخن کی صلاحیتوں سے بھی فیض یاب ہوئی۔

ذوقؔ نے اسے زبان کی سلاست اور امثال ومحاورہ بندی سے اور مومنؔ نے اپنے نازک طرز سخن سے نوازا تو غالبؔ نے ذاتی رباعیوں میں قصیدے کے رنگ بھر دیے اور ایک قسم کی طرفگی اور باریک بینی سے آشنا کیا، مگر اصل معاملہ یہی رہا کہ اس دور کے شعرا کی رباعیوں سے یہ صنف کچھ خاص امتیازی نہج بمشکل تمام ہی پا سکی۔

جہاں تک انیسؔ ودبیرؔ کی رباعیوں کا معاملہ ہے، اس میں شک نہیں کہ ان دونوں مرثیہ گو شعرا نے رباعی کو مجلسی صنفی بنا کر اس کی مقبولیت کے راستے کھول دیے اور اس رُخ سے اس صنف کے خاص محسنوں میں اپنی جگہ محفوظ کر گئے، لیکن بعض وجوہ سے بہرحال فطری طور پر ان کی رباعیاں شوخ وشنگ مضامین سے آشنائی نہ پا سکیں، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان دونوں کی بدولت میرؔ وسوداؔ کے مقابلے میں رباعی کو ایک نیا لب ولہجہ مل گیا۔

رباعی کی تاریخ میں حاؔلی اور اکبرؔ کا نام بھی آتا ہے اور یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ان کا موضوع بھی اگرچہ اخلاق ونصیحت ہی ہے، مگر ان کی رباعیوں میں انیسؔ ودبیرؔ سے کہیں زیادہ موضوعاتی وسعت بھی ہے اور دونوں کا رنگ وآہنگ بھی بالکل الگ الگ ہے۔ حاؔلی کے یہاں مولویانہ رنگ وروغن ہے اور اکبرؔ کے یہاں طنز وظرافت کا رنگ، پھر جدت پسندی اور قدامت پسندی نے بھی ان دونوں کا رنگ جدا کر دیا ہے۔ اگر یگاؔنہ، جوشؔ وفراقؔ، رواںؔ اور امجدؔ کی طرف دیکھیں تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں ہر ایک کا اپنا اپنا مزاج وماحول اور اپنا اپنا رنگ وآہنگ ہے۔

مذکورہ مشاہیر سخن سے قطع نظر جہاں تک عظیم آباد کے شاعروں کا معاملہ ہے اس میں شک نہیں کہ یہاں رباعی گوئی کی روایت زمانہ قدیم سے ہی وجود میں آئی۔ نہ صرف بہت سارے وہ شعرا جن کا تعلق خانقاہوں سے ہے بلکہ وہ صاحب دیوان شعرا بھی جن کے نام تذکروں میں بار بار آتے ہیں، اس صنف سے اپنا شغف دکھاتے رہے۔

راسخؔ نے سو سے زیادہ رباعیاں کہیں، مگر ان کی کاوشوں سے وسیع اور اساسی معنوں میں دیکھا جائے تو اس صنف کو امیدوں سے بہت ہی کم متاعِ اعتنا نصیب ہو سکی۔

ان مجمل اشاروں کے بعد اب آیئے، رباعیاتِ شاؔد کی طرف تو حمیؔد عظیم آبادی نے بجا طور پر ان کے مضامین میں بوقلمونیت اور رنگارنگی کے وصف کا ذکر کیا ہے اور ''رباعیات شاؔد'' کے دیباچہ میں یقیناً یہ بات کسی خاص مبالغہ کے بغیر ہی لکھی ہے کہ شاؔد کی اکثر وبیشتر رباعیاں صوفیانہ اور فلسفیانہ ہیں پھر:

''بعض رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں کہیں پیری کا اظہار ہے، کہیں شباب کی فراموش شدہ داستان پارینہ، کہیں ارباب وطن کی ناقدری کا گلہ ہے، کہیں اگلوں کی یادوں پر آنسو بہائے گئے ہیں اور کہیں برخود غلط رہبروں کی رہ نمائی اور ان کی اندھی تقلید سے متنبہ کیا گیا ہے۔''

شاؔد کی رباعیوں کا بنیادی عنصر عرفان وتصوف ہے تو اس میں چنداں حیرت کی بات بھی نہیں کہ یہ تو ان کے اپنے سلسلہ سخن کا فیضان ہے۔ درؔد اور اردو کی صوفیانہ شاعری اگر الگ الگ نہیں ہوسکتی تو شاؔد اور ان کی شاعری علی الخصوص ان کی رباعی گوئی بھی رنگ تصوف سے جدا نہیں ہوسکتی۔ شاؔد کے یہاں تصوف مذہبی فلسفہ سے زیادہ اگر روحانی تجربے کے طور پر آیا ہے تو یہ حضرت درؔد کا فیض روحانی ہی کہا جائے گا۔ حضرت آسؔی اور اصغؔر کے یہاں بھی تصوف ہے، مگر وہ صرف غزلیہ شاعری میں ہی ملتا ہے جب کہ شاؔد کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے رباعیوں میں بھی صوفیانہ مضامین کو بحسن تمام ادا کیا ہے۔ شاؔد کی رباعیوں کا تصوف سے بہت گہرا رشتہ ہے بقول مناظر احسن گیلانی:

''شاؔد عظیم آبادی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو رباعی میں تصوف کے مسائل کو اپنے کلام میں ایک خصوصی ایجابی صنف قرار دیا ہے اور ان کا یہ رنگ بہ نسبت ان کی غزلوں کے، ان کی رباعیوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ شاؔد نے تصوف کے بنیادی مسائل کو جن جن صورتوں میں پیش کیا ہے، اردو شاعری میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔''

شاؔد عظیم آبادی صرف اس خیال کے موید ہی نہیں تھے کہ تصوف شاعری کی جان اور عشق تصوف کی جان ہے، بلکہ انہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ اسے نمایاں طریقے سے یوں سامنے بھی لادیا ہے کہ مجازی عشق کو تصوف کے رنگ میں بدل کر، صوفیانہ رباعیوں کا حصہ اغلب بنادیا ہے۔

ارباب قیود تجھ کو کیا دیکھیں گے
خوبانِ نمود تجھ کو کیا دیکھیں گے
رویت کے لئے شرط ہے میدان وفا
پابند وجود تجھ کو کیا دیکھیں گے

اللہ پہ بالطبع بشر مائل ہے
ہر حال میں مطمئن اسی پر دل ہے
مشکل ہے کہ ثابت ہو دلیلوں سے خدا
انکار تو اس سے بھی سوا مشکل ہے

جو چاہئے دیکھنا نہ دیکھا میں نے
ہر شے پہ کیا ہے غور کیا کیا میں نے
اوروں کا سمجھنا تو بہت مشکل ہے
خود کیا ہوں اسی کو کچھ نہ سمجھا میں نے

شاؔد کی رباعیوں میں تصوف کے رنگ کی آمد، ان کی ذاتی زندگی کے بعض اشارے بھی یوں دے جاتی ہے کہ وہ عمر کے آخری ایام میں زمانے کے آلام اور معاش کی تنگی سے دوچار ہوگئے تھے جس کا اثر ان کی رباعیوں میں دنیا سے بیزاری کی علامت بن کر سامنے آیا اور غم دوراں سے نجات کی فکر اُنہیں اپیکورس کے فلسفہ نشاط کی طرف لے گئی، مگر یہ سہارا بھی ناکافی رہا، یہاں تک کہ بات آرزوئے مرگ تک آگئی اور شاؔد کی المیہ رباعیوں میں بہرکیف دل صدفگار کی پکار صاف صاف سنائی دینے لگی۔

جہاں تک فلسفہ کی بات ہے۔ خیاؔم اور دیگر شعرا کی بڑی جماعت قائلین جبر کی جماعت ہے، لیکن شاؔد اس جماعت سے الگ دکھائی دیتے ہیں اور اختیار کو اپنا مسلک بنا کر اپنی رباعیوں میں لاتے ہیں۔

جہاں تک اخلاقی رباعیوں کا معاملہ ہے، شاؔد کے یہاں اگر چہ زیادہ تر وہی مضامین نظم ہوئے ہیں جو پہلے سے نظم ہوتے چلے آرہے تھے، لیکن ان میں ایک کیف انشا اور مشق کہن کا پرتو یقیناً ہے۔ شاؔد اگرچہ اپنی مقصدیت میں حالؔی سے نزدیک یا جدت پسندی سے نزدیک کہے جائیں گے، لیکن اس میں کیا شک کہ ان کے یہاں پرانی

بات سے نئی بات نکالنے کا وطیرہ نمایاں ہے جو دلوں کو موہ لیتا ہے ۔

انصاف سے کام لے اگر مومن ہے
جو عدل کرے خلق کا وہ محسن ہے
جس قوم میں قدر ذی کمال کی نہیں
وہ قوم کرے عروج کیا یہ ممکن ہے

عاقل ہو تو حسن اخلاق میں فرد بنو
ایک ایک کے خیر خواہ و ہمدرد بنو
ہوشیار کہ ہے خود غرضی نامردی
للہ اسے ترک کرو ، مرد بنو

ناصح کی نصیحتوں کی تعظیم کرو
جو بات بتائے اسے تسلیم کرو
ہوشیار کہ مٹ رہے ہیں اخلاق قدیم
ان کہنہ عمارات کی ترمیم کرو

جہاں تک شاؔد کی خمریہ رباعیوں کا معاملہ ہے، ان میں بہرحال کیف و سرور اور سرمستی کی لہریں بھی موجود ہیں اور انہوں نے اس نوعیت کی رباعیوں میں ذکر جام وسبو سے جو دلکش اور خوبصورت نتائج اخذ کئے ہیں اُن میں استعاراتی شان بھی حد سے سوا ہے ۔

اس فصل میں بزم عیش وعشرت اچھی
ہو حق کا جہاں ہو غل وہ صحبت اچھی
ہے موسم گل ایسے میں پینا ہے تو پی
جو وقت پہ ہو ، وہی عبادت اچھی

ساقی مرا عیش تلخ کر دیتا ہے
مینا میں شراب خام بھر دیتا ہے
در پردہ نہاں ہے اس خوشی میں بھی
یہ وصل ، فراق کی خبر دیتا ہے

شاؔد کی رباعیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اس نتیجہ تک پہنچنا دشوار نہیں کہ پیری و جوانی اور زمانے کی بے ثباتی وغیرہ جو رباعی گو شاعروں کا عام اور محبوب موضوع رہا ہے، اسے بھی انہوں نے بہت عمدگی سے اپنے رباعیاتی کلام میں لایا ہے ۔

پیری کے ہیں دن گئی جوانی اپنی
ہم چھوڑ چلے بہت نشانی اپنی
اوروں کی تو سن چکے کہانی ہم سے
اوروں سے سنو گے اب کہانی اپنی

ہوں مثل حباب کیا ٹھکانہ میرا
کٹ جائے گا ایک دم میں زمانہ میرا
گر سانس نہ آئے سب کام ہیں بیکار
چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا

جہاں تک شاؔد کی رباعیوں کے اسلوبیاتی محاسن اور ان میں پائی جانے والی شاعرانہ صناعی کا تعلق ہے، یہ بات کسی خوف تردید کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ضرورت کے مطابق کہیں طنزیہ انداز سے اور کہیں سوالیہ اور انتہاہی انداز سے بخوبی تمام کام لیا ہے۔ بلیغ وتہدار اور حسین ولطیف استعارے اور نوع بنوع صنائع و بدائع کی مثالوں سے ان کی رباعیاں مرصع ہی نہیں از حد مرصع ہیں۔

بلاشبہ شاؔد کے یہاں نہ تو صنف رباعی کے فنی طنطنہ پر کہیں کوئی حرف آیا ہے اور نہ ہی فکری افادیت پر کہیں کوئی ضرب پڑی ہے۔ ان کی وفات کے سو سال بس مکمل ہونے کے قریب ہی ہیں، مگر آج بھی ان کے رباعی درپن میں دیکھیں تو وہ ایک البیلے فنکار کی حیثیت سے ہمیں زندہ جاوید کھڑے دکھائی دیتے اور یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ۔

روشن ہے کہ شاؔد سخن آرا ہوں میں
مشرق میں جو چمکا وہ ستارا ہوں میں
قوم ایک ، زبان و مسلک و مذہب ایک
سمجھو نہ مجھے غیر تمہارا ہوں میں

(تاریخ ادب اردو، اعجاز حسین، جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، عالمی سہارا، نئی دہلی، نیا بہار نمبر اگست ۲۰۰۷ء، ریڈیائی مقالہ ''شاؔد عظیم آبادی'' محمود علی خاں صبؔا، پندرہ روزہ ''آواز'' ج ۵۰ ش ۸ سے خصوصی استفادہ کے ساتھ)

❁❁❁

یادغلام سرور

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

غلام سرور کی ادبی خدمات

غلام سرور (ولادت ۱۰/جنوری ۱۹۲۶ء، وفات ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۴ء) کا شمار اُن نامور صحافیوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جو آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے آس پاس بہار کے اُفق پر نمودار ہوئے اور آزادی کے بعد یہاں کی اردو آبادی کی عزت اور وقار کے لئے مسلسل خامہ فرسائی اور تگ ودو کرتے رہے۔ غلام سرور ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ ذہین اور ہونہار طالب علم تھے۔ سائنس کالج، پٹنہ سے انٹر پاس کیا، پھر پٹنہ کالج سے انگریزی میں آنرس کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ ایم۔اے اردو کی تعلیم پٹنہ یونیورسٹی میں ہی پائی اور کامیاب طلبہ میں سرفہرست رہ کر طلائی تمغہ حاصل کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی ہی سے ایل ایل بی کی تعلیم لیا اور وکالت کی ڈگری حاصل کی۔

غلام سرور نے جو زمانہ اپنے زمانۂ شباب میں دیکھا، وہ ہمارے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔ اس زمانے میں اردو وفارسی کی تعلیم عام تھی اور اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک قابل اور باصلاحیت ومخلص اساتذہ زبان وادب کی تدریس کے فرائض ذوق وشوق سے ادا کرتے تھے۔ غلام سرور اگر چہ انٹر سائنس کے طالب علم تھے، مگر اردو کے کلاسوں میں انہوں نے ڈاکٹر اختر احمد اورینوی کے درس اور لیکچر میں شریک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان کے اندر جو ادیب وصحافی تھا وہ جاگ اُٹھا اور وہ بی اے انگلش آنرس کے طالب علم بن گئے۔ انگریزی ادب سے اردو ادب کی طرف ان کی مراجعت ان کے لئے اور اردو ادب وصحافت کے لئے سود مند ثابت ہوئی۔ غلام سرور نے اپنے مجموعہ مضامین ''پرکھ'' کا پیش لفظ لکھتے ہوئے اپنے خاص اساتذۂ کرام اور اپنے احباب کا ذکر خیر مندرجہ ذیل لفظوں میں کیا ہے:

''سب سے پہلے مجھے کہنے دیجئے کہ اگر میرے شفیق والدین کی محبت، میرے محترم اساتذہ بالخصوص پروفیسر حافظ شمس الدین احمد شمس منیریؔ، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر سید صدرالدین احمد، پروفیسر علامہ جمیلؔ مظہری کی سرپرستی، اردو کے چند جدید مقتدر ناقدین خصوصاً پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر سید احتشام حسین اور علامہ نیاز فتح پوری کی رہنمائی، میرے عزیز احباب خاص کر سید احمد، شہباز حسین، محمد عزیز، محمد نعمان، سید حسن، قمر التوحید، سعید اختر اور اسد شاہین کی ہمدردیاں، حوصلہ افزائیاں اور مفید مشورے اور ریاست بہار کی واحد سرگرم ادبی انجمن حلقہ ادب بہار کی تحریک نہ ہوتی تو میں یقینی وہاں نہ ہوتا جہاں آج ہوں۔''

(۲۰/اپریل ۱۹۵۱ء)

غلام سرور نے جس زمانے میں انگریزی پڑھی، ایم اے اردو میں ٹاپ کیا، ایل ایل بی پاس کیا، اُس زمانے میں وہ چاہتے تو اعلیٰ سرکاری نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور کامیاب ہو جاتے، پروفیسری یا لیکچراری چاہتے تو مل جاتی، وکالت کرتے تو کامیاب اور نامی وکیل ہوتے، مگر انہوں نے اردو بولنے والوں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی زاروزبوں حالت دیکھی تو ان کی غربت اور ذلت کی زندگی کو عزت اور وقار کی زندگی میں مبدل کرنے کے لئے اپنی تقریر وتحریر کی ساری طاقت جھونک دی۔ انہوں نے ارباب حکومت کے آگے اردو والوں اور دبے کچلے لوگوں کے حقوق کی بات کی، تحریکیں چلائیں، ملت کے نوجوانوں کو متحد و سرگرم ہونا

سکھایا۔ وہ اپنی حق گوئی اور بے باکی و بے خوفی کا پرچم بلند کرتے رہے۔ انہیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزارا گیا تا کہ اُن کی ہمت ٹوٹ جائے اور وہ حکومت اور ارباب حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف لکھنا اور بولنا چھوڑ دیں، مگر وہ اپنی روش پر مضبوطی اور صبر و استقلال سے قائم رہے۔ انہوں نے اپنا اخبار ہفتہ وار اور روز نامہ ''سنگم'' ۱۹۵۳ء میں نکالا اور اس اخبار کے ذریعہ وہ حکومت کی غلط پالیسیوں اور کمزوروں اور اقلیتوں کے حقوق کی پامالی اور غصب پر بے دھڑک چیختے رہے۔ انہیں بار بار زندان و سلاسل کی منزل سے گزرنا پڑا، مگر وہ ہمیشہ سرخرو اور سر بلند رہے۔ اردو والوں نے ان کو اپنا ہمدرد و ہم نوا سمجھا، بہار کی غریب اور ہراساں اقلیت نے ان کو اپنا رہنما تسلیم کیا اور ان کی برپا کی ہوئی تحریکیوں میں ان کے شیدائیوں نے ان کا ساتھ دیا اور جب وہ صحافت سے سیاست کے میدان میں آئے اُس وقت بھی بہار کی اردو آبادی نے ان کی حمایت کی اور ان کو ایوانِ حکومت تک پہنچایا۔

غلام سرور کی صلاحیتوں کا ظہور صحافت، ادب اور سیاست میں کھل کر ہوا۔ ان کی صحافتی اور سیاسی خدمات و فتوحات پر لوگوں نے لکھا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ میں یہاں ان کی ادبی خدمات کے چند اہم گوشوں پر ہی روشنی ڈالوں گا اور مضمون کے آخر میں ان کی جیل ڈائری ''گوشے میں قفس کے'' کے حوالے سے ان کے افکار و خیالات اور اسلوبِ نگارش کے محاسن کو اُجاگر کرنے کی سعی کروں گا۔

غلام سرور انگریزی اور اردو ادب کے طالب علم تھے اور انہوں نے اس زمانے کے سب سے اچھے کالج پٹنہ کالج اور اس کالج کے بہترین اساتذہ کرام سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی بنیادی تربیت ان کے بہت کام آئی۔ زبان پر اُن کی گرفت اور اظہار و بیان پر ان کی قدرت نے ان کو ایک عمدہ صحافی اور ایک اعلیٰ دانشور اور ادیب بننے میں معاونت کی۔ وہ زمانۂ طالب علمی سے ہی ادبی و علمی موضوعات پر مقالے لکھنے لگے اور مقتدر رسالوں میں ان کے مضامین اشاعت پذیر ہونے لگے۔ قانون اور تاریخ کے مطالعہ نے ان کی دانشورانہ اور منطقی و عالمانہ گفتگو کو طاقت بخشی۔ اپنی مادری زبان سے محبت اور اپنے آس پاس کے دبے کچلے لوگوں کے دکھ درد میں سچی شرکت نے ان کی زبان اور قلم میں قوت بھر دی۔

اقبالؔ اور ابوالکلام آزادؔ کے مطالعے نے اُن کے افکار و خیالات کو بلند کیا، پروفیسر اختر اورینوی اور علامہ جمیلؔ مظہری کی سرپرستی نے ان کو اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا صحیح مصرف لینا سکھایا۔ پٹنہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے ادبی و علمی ماحول اور اقبال ہاسٹل (مسلم ہاسٹل) کے بہترین بورڈرز نے ان کی ذہانت و خطابت کی تعریف و تحسین کر کے ان کی ادبی صلاحیتوں کو چمکنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع پیدا کئے پروفیسر شکیل الرحمٰن اپنی خودنوشت سوانح عمری ''آشرم'' میں اُس زمانے کے غلام سرور سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''حلقہ ادب غلام سرور کی نگرانی میں پروان چڑھ رہا تھا۔ سعید اختر، قمر التوحید، شبیر حسن، شہباز حسین، ظل حسن، اسداللہ وغیرہ اس کے سرگرم رکن تھے۔ غلام سرور اکثر ہوسٹل آتے رہتے اور ترقی پسندوں کے خلاف بحث میں حصہ لیتے رہتے۔ ترقی پسندوں کی جماعت بھی بہت مضبوط تھی، اکثر لطیف سا تصادم بھی ہو جاتا۔''

(آشرم، ص ۲۰۲)

ادبی دنیا میں غلام سرور کی اُٹھان بہت شاندار تھی، سب سے پہلے ان کی تمثیل ''اقبالؔ میدانِ حشر میں'' نیازؔ فتح پوری کے رسالہ ''نگار'' اگست ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ مقتدر و معروف ادیبوں نے تعریف کی، پھر ''نگار'' کے شمارہ دسمبر ۱۹۵۰ء و مارچ ۱۹۵۱ء میں ان کا طویل مقالہ ''ترقی پسند تحریک'' شائع ہوا۔ وہ زمانہ ترقی پسندی کے عروج کا تھا اور ترقی پسندوں کی آواز سے الگ کوئی آواز پیدا کرنا ہمت و حوصلے کا کام تھا۔ غلام سرور نے ترقی پسندوں کے ادبی کارناموں اور اعلیٰ فن پاروں کی خوبیوں کا

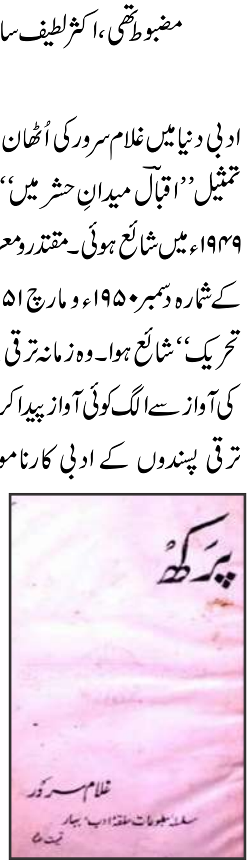

اعتراف کیا، مگر ادیبوں اور فنکاروں پر مخصوص فکر اور نظریے کے ماتحت ادب کی تخلیق کے فرمان اور فارمولے کو رد کیا۔ غلام سرور اور پروفیسر عبدالمغنی دونوں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسندوں کے فارمولا ٹائپ ادب کی مخالفت برملا کی۔ مذکورہ دو

مضامین کے علاوہ غلام سرور کا ایک مقالہ اُسی زمانے میں یعنی ۱۹۵۱ء میں رسالہ ''اردو ادب'' علی گڑھ میں شائع ہوا، عنوان تھا ''مواداور ہیئت''۔۱۹۵۱ء ہی میں غلام سرور کے پانچ منتخب مضامین اور ایک تمثیل پر مشتمل ان کی کتاب ''پرکھ'' شائع ہوئی۔ اس مجموعہ مضامین کا مقدمہ پروفیسر آلِ احمد سرور اور تعارف پروفیسر اختر اورینوی نے لکھا۔ ''پرکھ'' میں شامل مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تاریخ ادب اردو مصنفہ سکسینہ (۲) شہنشاہ حبشہ
(۳) اردوصحافت (۴) اقبالؔ کی غزلیں
(۵) ترقی پسندتحریک (۶) مواداور ہیئت

اس کتاب کا پہلا مضمون ہی بہت معرکے کا ہے۔ اردو ادب کی تمام تاریخیں بہار سے باہر لکھی گئی ہیں۔ ان میں بہار کے ادباو شعرا کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ایک شادؔ عظیم آبادی کا ذکر مل جاتا ہے۔ سکسینہ نے تاریخ ادب اردو انگریزی میں لکھی اس کا ترجمہ مرزا محمد عسکری نے اردو میں کیا ہے۔ غلام سرور نے اپنے مضمون میں بڑے مدلل انداز میں سکسینہ کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ تاریخ ادب اردو میں بہار کے ادیبوں، شاعروں کی شمولیت کے بغیر کوئی تاریخ ادب اردو مکمل و معتبر نہیں ہوسکتی۔ آلِ احمد سرور نے ''پرکھ'' کا مقدمہ لکھتے ہوئے غلام سرور کے موقف کی تائید کی ہے:

> ''اس (مضمون) میں سکسینہ کی ایک بڑی خامی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے بہار کے شاعروں اور ادیبوں کو قریب قریب نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو ادب کی کوئی تاریخ راسخؔ عظیم آبادی، شورشؔ، جوششؔ، صفیرؔ بلگرامی، شادؔ عظیم آبادی، نصیر حسین خیالؔ اور خدا بخش لائبریری کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی، مگر اس کوتاہی میں سکسینہ یا عسکری تنہا نہیں ہیں، دوسرے لوگوں نے بھی بہار کی خدمات کا پورے طور پر اعتراف نہیں کیا۔''

غلام سرور نے کسی علاقائی عصبیت کے تحت یہ بات نہیں لکھی ہے بلکہ انہوں نے اصولی طور پر گرفت کی ہے۔ انہوں نے اپنے اُسی مضمون میں لکھا ہے کہ اردو کی نشو ونما اور اردو ادب و شاعری کی تخلیق میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بھی خدمات ہیں اور اُن صوبوں کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ بھی تاریخ ادب اردو میں ضرور ہونا چاہئے۔

''شہنشاہِ حبشہ'' غلام سرور کا دوسرا مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے ڈاکٹر اختر اورینوی کے ڈراما ''شہنشاہِ حبشہ'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مضمون میں مصنف نے اپنے موضوع سے ہٹ کر یورپ میں ڈراما نگاری کی تاریخ بیان کی ہے اور ڈرامے کے فن پر خامہ فرسائی کرنے لگے ہیں۔ مضمون غیر ضروری طور پر طویل ہوگیا ہے البتہ مضمون کے آخری چار صفحات میں ڈراما ''شہنشاہِ حبشہ'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے فنی اعتبار سے اس ڈرامے کو کمزور اور ناکام بتایا ہے۔ غلام سرور کی یہ جرأتِ گفتار ہی ہے کہ انہوں نے اپنے استاذِ معظم اختر اورینوی کی تخلیق سے متعلق اپنی رائے بے خوف لکھ دی اور استاد کی بھی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے غلام سرور کی اس کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے ان کی ادبی صلاحیتوں اور تنقیدی نگاہ کی تعریف ہی کی ہے:

> ''غلام سرور نے جس نگاہ سے ادب، تخلیق ادب، زندگی اور تحریکات زندگی کا مطالعہ کیا ہے، اُس میں توازن ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ نوجوان ہیں اور بڑے سرگرم ہیں۔ کام کرنے اور کئے جانے کی ان کو عادت سی ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا گرم جوش نوجوان ترقی کو ضرور پسند کرے گا، کیونکہ دراصل وہ عمل کرتا ہی ہے ترقی کے لئے ......لیکن غلام سرور نام نہاد ترقی پسندی کی کھوکھلی شورشوں سے آگاہ ہیں۔ ابھی سرور کے لئے وہ دور نہیں آیا ہے جب وہ قطعی طور پر یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ ان کے عمل اور جدوجہد کی منزل آخر کیا ہوگی، لیکن انہیں سمت کا پتہ چل گیا ہے۔ میرے خیال میں اس عبوری دور میں اگر کسی قلم کار کی طبیعت میں توازن پایا جاتا ہے تو یہ بہت بڑی برکت کی بات ہے اور سلامتی راہ کے لئے بہت بڑی ہدایت ہے۔''

اقبالؔ کی غزل گوئی پر بہت لکھا گیا ہے۔ غلام سرور نے ''اقبالؔ کی

غزلیں'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے وہ بہت اہم اور وقیع ہے۔ اس مضمون سے ان کی اقبالؔ فہمی و اقبالؔ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں گومگو کے شکار نہیں ہوتے بلکہ بہت واضح لفظوں میں ان کی شاعری خصوصاً غزل گوئی سے متعلق اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

''اردو غزل کی دنیا میں ہمیں پہلی بار اقبالؔ کی ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس نے غزل کے روایتی حدود کو ترک کیا...... اقبالؔ شاعر حیات ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ زندگی کا راگ الاپتا ہے بلکہ اس کا اپنا ایک فلسفہ زندگی بھی ہے، اپنا ایک نظریۂ حیات، ایک خاص نقطہ نگاہ ہے، اسی لئے اس کی اکثر غزلوں میں جذبات کی شدت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اقبالؔ 'چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی' کو حدیث بے خبراں سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر زمانہ موافق نہیں تو 'با زمانہ ستیز' کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ خود بھی اس پر عامل ہوا اور غزل کی فرسودہ روایت کے طوفان کا منھ موڑ دیا۔ وہ ساحل پر کھڑا ہو کر طوفان کا نظارہ کرنے والا نہ تھا، بلکہ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے کا قائل تھا۔ وہ بحر کی موجوں میں سکون نہیں، اضطراب چاہتا تھا۔ اس کے لئے طوفان سے آشنائی ضروری تھی۔ اقبالؔ نے اردو شاعری کو موضوع دیا، وسعت دی، فکر، تعمق، گہرائی اور حکیمانہ نظر عطا کی۔ ہیئت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ کرتے ہوئے بھی اقبالؔ نے مواد میں انقلاب برپا کر دیا اور یہی اس کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔ اقبالؔ کی غزلوں میں ان کے فلسفوں کا عرق ہے، ان کا پیغام رجائیت، خوش آئند مستقبل کی بشارت، ایک عالم نو کی تشکیل کی مخبری، ایک پیہم رواں ہر دم جواں رہنے والی زندگی کا پیغام ہے۔''

غلام سرور کی کتاب ''گوشے میں قفس کے'' ایک اہم کتاب ہے۔ یہ دراصل جیل کی ڈائری ہے جس میں غلام سرور نے جیل خانے کے اپنے روز وشب اور وہاں کے دوسرے زندانیوں کے حالات بیان کئے ہیں۔

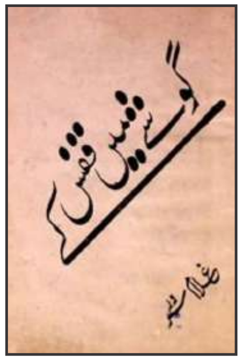

''گوشے میں قفس کے'' پہلی بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی، پھر ۱۹۷۱ء میں اور تیسری بار ۲۰۰۱ء میں چھپی۔ اشاعت سوم میں دو کتابوں کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے، یعنی ''گوشے میں قفس کے'' اور ''جہاں ہم ہیں''، ''گوشے میں قفس کے'' ۱۹۶۴ء کی گرفتاری کے زمانے میں لکھی گئی تھی اور ''جہاں ہم ہیں'' ۱۹۶۵ء کی گرفتاری کے زمانے میں۔

۱۹۶۴ء میں غلام سرور کو ڈیفنس آف انڈیا رولز (D.I.R) کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور انہیں بانکی پور جیل اور ہزاری باغ جیل میں تقریباً چار ماہ قید وبند کی صعوبتیں اُٹھانی پڑیں۔ ڈی آئی آر کے تحت ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۲ء تک انہیں چھ بار گرفتار کیا گیا۔

جیل کی اس ڈائری کا پہلا ورق جمعرات ۱۴رمئی ۱۹۶۴ء کو لکھا گیا اور اس کا آخری ورق اتوار ۲۳راگست ۱۹۶۴ء کو۔ یہ غلام سرور کی اہم تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں غلام سرور کا نقطہ نظر اور ان کی شخصیت کے کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غلام سرور نے زندان وسلاسل کے مرحلے کو بڑی بہادری اور صبر سے انگیز کیا۔ انہوں نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے اور ایامِ اسیری میں اپنے دیرینہ اور مضبوط رفیق ''قلم'' کا سہارا لیا۔ اپنے روز روز کے معمولات ومسائل اور احساسات و جذبات لکھنے لگے۔ اس طرح زندگی کے بہت سے معاملوں میں ان کے خیالات، ان کی دلچسپی اور ترجیحات ڈائری میں سمٹ آئیں۔

غلام سرور ادب کے طالب علم رہے تھے، اس لئے زندانی ادب سے متعلق ان کی اچھی واقفیت تھی۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفرؔ، ابوالکلام آزاد اور فیض احمد فیضؔ کی اسیری کے واقعات اور اسیری سے متعلق ان کی تحریریں پڑھی تھیں۔ غلام سرور نے اپنی جیل ڈائری کو فیضؔ، اقبالؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کے اشعار سے جابجا مزین کیا ہے۔ ابوالکلام آزاد کے خیالات والفاظ جو ''غبارِ خاطر'' میں ملتے ہیں، ان کی گونج بھی غلام سرور کی تحریروں میں جابجا نظر آتی ہے۔ غلام سرور کی شخصیت کا مذہبی

اور اسلامی پہلو بھی اُبھرتا ہے۔ ان کا قرآنی و اسلامی نقطہ نگاہ بھی ان کی تحریروں سے جھانکتا ہے۔ اس جیل کی ڈائری سے چند پیراگراف نقل نہیں کئے جائیں گے تو یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ غلام سرور کی تحریر کا موضوع و مواد کیا ہے اور ان کے لکھنے کا اسلوب کیا ہے، چنانچہ کتاب سے جستہ جستہ چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔ اپنی ڈائری میں غلام سرور نے ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ خداوندانِ سیاست نقل تو اتارتے ہیں خداوند کائنات کی (نعوذ باللہ) لیکن یہ اولادِ ابلیس بازیگرانِ فرنگ کے شاگردِ رشید کا رول ادا کر رہے ہیں۔ خالق مطلق جب چاہے جسم کے قید خانے میں روح کو قید کر کے انسان پیدا کر دے اور جب چاہے روح کو آزاد کر کے انسان کو موت دے دے...... یہ (قانون) اس کے ذریعہ جسے جب چاہا جیل خانہ کی دیواروں میں مقید کر دیا اور پھر اسے جب چاہا اس قید خانے سے نکال دیا۔ ہر جرم کے لئے عدالت ہے، قانون کا دروازہ ہے، شہادتوں کی منزلیں ہیں، ثبوت کے مواقع ہیں اور سب کے بعد اگر سزا ہو جائے تو قید کی مدت متعین ہے، لیکن ڈی آئی آر کے لئے نہ کسی الزام کی ضرورت ہے، نہ کوئی عدالت درکار، نہ کسی شہادت کی ضرورت اور نہ کوئی مدت متعین۔ حکومت اور حاکموں کا حسن کرشمہ ساز جسے چاہے اور جب تک چاہے اسیر زلف تاریکی زنداں رکھے اور جب چاہے اپنے دیوانوں کی فہرست سے ان گرفتارانِ بلا کا نام خارج کر دے۔''

ایک دوسرے مقام پر غلام سرور، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح لذتِ سحر خیزی کا ذکر کرتے اور آہِ سحر گاہی کے ساتھ اقبالؔ کی طرح اللہ تعالیٰ سے ''شرابِ کہن'' کی طلب کرتے ہیں:

''ہزاری باغ میں لذتِ سحر خیزی کے جو مزے لوٹے وہ کبھی نصیب نہ ہوئے تھے...... آہِ سحر میں جو اثر ہے اور جو گداز ہے اُس کا صحیح تجربہ یہیں آکر ہوا۔ کمرے ہی پر وضو کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، تلاوتِ کرتا ہوں، کلام اقبالؔ بہ آوازِ بلند پڑھتا ہوں، اپنے پیدا کرنے والے ساقی سے شرابِ کہن کے دو گھونٹ مانگتا ہوں اور پھر وہی قلب ونظر مانگتا ہوں۔''

یہاں قارئین کرام کو یاد دلا دوں کہ غلام سرور علامہ اقبالؔ اور مولانا آزاد کی تحریروں سے بہت اثر پذیر ہوئے تھے، چنانچہ ان دونوں کے افکار وخیالات کا ان پر گہرا اثر پڑا تھا۔ منقولہ بالا عبارت میں جس ''شرابِ کہن'' کے دو گھونٹ کا ذکر ہے وہ اقبالؔ کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے ۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

نیز غلام سرور اور مولانا آزاد میں کئی مماثلتیں تھیں۔ مولانا آزاد بھی صحافی تھے اور غلام سرور بھی، مولانا بھی بے مثل خطیب تھے اور غلام سرور بھی بے نظیر خطیب ومقرر، حاکمانِ وقت سے کشمکش مولانا نے بھی کی اور غلام سرور نے بھی، قید و بند کی صعوبتیں مولانا آزاد نے بھی جھیلیں اور غلام سرور نے بھی برداشت کیں۔

جیل کی اس ڈائری کے مطالعے سے غلام سرور کی شخصیت کا یہ رُخ بہت اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ وہ انقلابی (Revolutionary) تھے اور ان کی انقلابی فکر وعمل کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے۔ جس دور کو غلام سرور نے دیکھا اس دور میں ملت کے بہت سے ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان کمیونزم اور دہریت و مادّیت کے شکار ہو گئے یا دولت و اقتدار کی ہوس میں ظالموں سے جا ملے۔ غلام سرور باغیرت، حساس اور مذہبی انسان تھے۔ انہوں نے ملت کے مفاد کو مقدم رکھا، پریشان حال لوگوں کی مدافعت اور ان کے حقوق کی بحالی و بازیابی کے لئے سرگرم عمل رہے۔ ان کی جیل ڈائری میں ان کے عشق رسول اور حضرت حسینؓ سے ان کی عقیدت ومحبت کا اظہار ہوا ہے:

''اسے اتفاق ہی کہئے کہ محرم، چہلم اور فاتحہ دوازدہم جیل

ہی میں گزارنے پڑے۔محرم بانکی پور میں اور بقیہ ہزاری باغ میں۔تاریخ کائنات کی اہم ترین پیدائش اور اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں عظیم ترین شہادت کی یادگاریں جیل میں ہی منانی پڑیں۔ایک وہ جس پر دین کی تکمیل ہوگئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ آیت۳) اور دوسرا وہ جس نے میدانِ کربلا میں پھر اسلام کو زندہ کردیا ع

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک وہ جس کی بزرگی، فضیلت اور برتری ربِ کریم کی عطا کردہ تھی اور دوسرا وہ جس نے خاندانی ورثے میں بزرگی و برتری پائی تھی۔باپ شیر خدا، ماں خاتونِ جنت، نانا خاتم النبیین، ایک وہ جس نے فاران کی چوٹی پر چراغِ حق روشن کیا اور دوسرا وہ جس نے اسی شمع حق کی بجھتی ہوئی مدھم لو کو لہو کا تیل دے کر فرات کے ساحل پر تیز تر کردیا۔ایک وہ جس نے دنیا کو درس دیا کہ اصل حیات بعد از ممات ہے اور دوسرا وہ جس نے اس پیغام کو عملاً ثابت کردیا۔ایک وہ جس نے طاغوت کے آگے سر نہ جھکانے کی تعلیم دی اور دوسرا وہ جس نے طاغوت کے آگے سر تو دے دیا، مگر اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں نہ دیا ع

سر داد نہ داد دست در دست یزید

ایک روز جیل میں انہیں ایک کتاب مل گئی۔یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تھی جس کا مصنف ایک انگریز میڈوس ٹیلر تھا اور اس پر نظرِ ثانی بھی ایک انگریز ہی نے کی تھی۔کتاب ٹیپو سلطان سے متعلق تھی۔سب کو معلوم ہے کہ ٹیپو سلطان ملت کا ایک بطلِ جلیل تھا جس نے بہادری اور عزیمت کی مثال قائم کی تھی۔ٹیپو سلطان سے علامہ اقبالؔ کو بے حد عقیدت تھی اور غلام سرور کو بھی۔اس کتاب میں انگریز مصنف نے ٹیپو سلطان کی شبیہ کو بگاڑنے کی سعی کی ہے۔غلام سرور کتاب پڑھ کر اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہیں:

> ''اس کتاب میں سلطان کا جو تمسخر اڑایا گیا ہے نا قابل برداشت ہے۔''

جرم و سزا کے فلسفے پر گفتگو کرتے ہوئے غلام سرور نے تفصیل سے لکھا ہے۔انہوں نے اسلام کے قوانین جرم و سزا کی حمایت و وکالت کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن نے جرائم کی تخفیف اور معاصی کو مٹانے کی جو تدبیریں تجویز کی ہیں اور جو قوانین وضع کئے ہیں، وہی مسئلوں کے اصل اور حقیقی حل ہیں۔دنیا کی بقیہ قوموں نے اپنی سمجھ سے جرائم کی روک تھام کے لئے سزا کے جو طریقے ایجاد کئے ہیں وہ سب ناقص و ناکافی ہیں۔اس طویل مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''جس طرح اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے حیات کے لئے ٹھوس اصول منضبط کئے اسی طرح جرم و سزا کا کلیہ بھی مقرر کیا۔قرآن، حدیثوں اور تفسیروں کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن نے صاف واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بعض جرائم کی نشان دہی کی ہے اور ان میں سے بیشتر کے لئے سزا بھی تجویز کردی ہے۔افسوس کا مقام ہے کہ آج بہت سی مسلم مملکتیں ہیں، مگر ان میں بیشتر ایسی ہیں جہاں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے......بات یہ ہے کہ سزائے موت سے تمام جرائم کیا چھومنتر ہوجائے گا، اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ چاہے چند، معدود اور مخصوص جرائم ہی کے لئے کیوں نہ ہو، مگر سزائے موت کا بحال رکھا جانا اُس وقت تک لازمی امر ہے جب تک موت سے ڈرنا انسانی فطرت میں داخل ہے۔قتل و خون اور زنا بالجبر جیسے سنگین افعال کی سزا تو موت ہی ہونی چاہئے۔ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے بڑے جرائم کے لئے سخت سے سخت اور عبرت ناک سزائیں دی جانی چاہئے، لیکن جرم و سزا کا مسئلہ یہیں پر حل نہیں ہوجاتا، اس غرض سے سب سے زیادہ ضروری اس سماج کی تشکیل اور اس سماجی ماحول کی موجودگی ہے جو صحت مند اور صالح ہو اور جس میں ہر آزاد بندہ آزادی کے ساتھ امن و سکون سے اپنی

نیک زندگی بسر کرسکے ...... اسلام کی ضونمودار ہوئی تو عورتوں کو ذلت کی نظر سے دیکھا جانا بند ہوگیا۔ اس کا اثر عرصۂ دراز تک باقی رہا، لیکن تہذیب جدید نے جہاں ہمیں دنیا کی تمام نعمتوں سے مالامال کرنے کے ساتھ دنیا کو برباد کرنے والا جوہری بم بھی دیا ہے وہیں اُسی مغربی تہذیب اور موجودہ سائنسی دنیا نے 'آزادی' کے نام پر سماج میں ان ساری برائیوں کا چلن عام کردیا ہے جو ننگ انسانیت ہیں۔''

جیل میں ایک مرتبہ عبدالقیوم انصاری صاحب جو اُس وقت محکمہ جیل کے منسٹر تھے، غلام سرور سے ملاقات کے لئے آئے۔ اس ملاقات اور جناب انصاری صاحب سے اپنے تعلقات کا ذکر غلام سرور نے جن الفاظ میں کیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ غلام سرور اور عبدالقیوم انصاری الگ الگ سیاسی خیموں میں تھے اور ان کے درمیان نظریاتی اختلاف بھی تھا، اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ اس مقام پر افتخار امام صدیقی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے ؎

وہ لوگ کیا تھے جو دشمنی میں وقار رکھتے تھے دوستی کا
یہ لوگ کیا ہیں جنہیں سلیقہ نہ دوستی کا ، نہ دشمنی کا

غلام سرور نے لکھا ہے:

''وہ آئے اور میرے ساتھ بیٹھ گئے، چائے پی، میری صحت کے متعلق دریافت کیا۔ انصاری صاحب کا رویہ ہمدردانہ اور برادرانہ تھا۔ میرے دل میں دوستانہ اور پرخلوص شکایت کا جو میل پڑ گیا تھا آنکھوں کے پانی اور ملاقات کی رگڑ سے صاف ہوگیا۔ سیاسی طور پر انصاری صاحب کی اور میری راہ جداجدا ہی ہے، شروع ہی سے، آج بھی ہے، شاید آگے بھی رہے۔ سیاسی پلیٹ فارم اور اخبار کے کالموں میں نہ میں نے کبھی انصاری صاحب کو معاف کیا اور نہ انہوں نے مجھے چھوڑا، پھر بھی ذاتی ملاقاتوں اور نجی صحبتوں اور کم سے کم اردو کے پلیٹ فارم پر ہم پندرہ سال سے ساتھ رہے ہیں۔ وہ اب بھی مجھ سے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور میں بھی اس معاملے میں ان کی خلوصِ دل کے ساتھ قدر کرتا ہوں۔''

جیل کی چہار دیواری میں غلام سرور کو اپنے بعض احباب یاد آئے۔ محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ کی جب یاد آئی تو وہ ان پر پورا صفحہ لکھ گئے۔ محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ عظیم آباد کے وہ درد مند ملت اور قائد اردو تھے جن کی خدمات کو نئی نسل ذرا بھولتی جارہی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غلام سرور کی ڈائری کا وہ ورق نقل کردیا جائے:

''اسیری کی مدت میں مرحوم ایوب صاحب بہت یاد آئے ......ایوب صاحب سے میری ملاقات پندرہ سال پرانی تھی۔ اردو ہی کی نسبت سے ہم ملے اور اسی حال میں وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ میں انہیں ہمیشہ ایوب صاحب کہتا، وہ مجھے سرور صاحب کہتے۔ ایوب صاحب اس ملک کے موجودہ ان معدودے چندلوگوں میں سے تھے جن کا میں دل سے احترام کرتا۔ وہ مخلص تھے، ایماندار تھے اور بے لوث تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال صرف خدمت قوم وملت اور خدمت زبان و ادب میں گزار دئے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنی صدارت کے چھ سال میں انہوں نے بلا مبالغہ اپنی جیب خاص سے کم از کم دس ہزار روپوں کی رقم انجمن اور اردو کی خاطر خرچ کی۔ اردو گرلز ہائی اسکول کا قیام ایوب صاحب مرحوم کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس اسکول کے قیام کی ضرورت پر میں نے ایک بار ان سے زور دیا۔ تھوڑے ہی دن بعد 'سنگم' نے ایک اداریہ سپرد قلم کیا۔ جلد ہی ریاستی انجمن نے تجویز منظور کی اور ایوب صاحب نے یہ اسکول قائم کردیا۔ کم و بیش دس ہزار روپوں کی رقم انہوں نے اپنی جیب سے اس اسکول کے لئے بھی خرچ کردی۔ افسوس موت کے بے رحم ہاتھوں نے ایوب صاحب کو ہم سے اچانک، بے وقت اور بہت جلد چھین

لیا......اسکول کو انہوں نے اپنا مکان، نیا مکان، زمین اور کار دے دی۔ مرتے دم تک اسکول کا خیال رکھا۔ کاش! آج ایوب صاحب زندہ ہوتے! وہ ہوتے تو آج میری گرفتاری کے بعد بہار کے مسلمان جس افراتفری اور انتشار میں مبتلا ہیں، یہ نوبت ہرگز نہ آتی۔ وہ نڈر بھی تھے، بیباک بھی اور بے غرض بھی۔ آج کون ہے جو بہار کے مسلمانوں کی بے لوث خدمت اپنی جان، جسم، مال و زر اور ذہن وفکر سے کر سکے؟ جسے اقتدار کی ہوس نہ ہو، جسے سیم وزر کی لالچ نہ ہو، جس کے سامنے اپنا ذاتی مفاد پوشیدہ نہ ہو۔ جس کی ہر سانس قوم اور ملت کے لئے ہو، جس کی کمائی جس کی جائداد، جس کی محنت سب تعمیر ملت کی راہ میں خرچ ہوں۔ ایوب تو کبھی نہیں مرے گا، ایوب تو امر ہے تیری قوم نے تیرے مرنے کے بعد تیری خدمات کا اعتراف عملاً کیا۔ حشر کے روز خدائے واحد بھی تجھے اس کارِ خیر کا اجر ضرور دے۔ آمین ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے''

دوسری بار جب ۱۹۶۵ء میں غلام سرور جیل گئے تو اُس زمانے میں ان کے والد شدید بیمار ہو گئے۔ بعض احباب نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی اہلیہ کی طرف سے حکومت کو ایک درخواست دلوایئے تو قوی امید ہے کہ حکومت آپ کو کچھ دن کے لئے پیرول پر رہا کر دے، مگر غلام سرور نے ایسی درخواست بھجوانے سے صاف انکار کر دیا۔ غلام سرور نے لکھا ہے کہ مولانا آزاد جب قلعہ احمد نگر میں اسیری کی مدت گزار رہے تھے تو ان کی اہلیہ شدید بیمار تھیں، حکومت کے بعض اعلیٰ حکام کے ذریعے معلوم ہوا کہ مولانا اگر درخواست دیں تو حکومت ان کو پیرول پر رہا کر دے گی تا کہ وہ اپنی بیمار اہلیہ کو دیکھنے جا سکیں، مگر مولانا آزاد نے دوستوں کی اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ اس معاملے میں بھی غلام سرور نے مولانا آزاد کی پیروی کی۔ (ملاحظہ ہو کتاب ''گوشے میں قفس کے'' ص ۱۶۶ تا ص ۱۶۸)

غلام سرور اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کی جڑواں بیٹیوں (تارہ، ستارہ) کی سالگرہ تھی۔ اس سالگرہ کے موقع پر انہوں نے اپنی بیٹیوں کو جیل ہی میں ملاقات کے لئے بلایا۔ ڈائری کا وہ ورق ملاحظہ فرمائے اور غلام سرور کے اسلوب نگارش کی داد دیجئے۔ کس طرح انہوں نے بات سے بات پیدا کی ہے اور کس طرح قرآنی آیات سے اپنی تحریر کو مزین کیا ہے:

''ہر سال سولہ جولائی کو اپنی توام بچیوں تارہ اور ستارہ (یہ نام ان کے دادا نے رکھا ہے، ان کے پردادا ڈاکٹر عبدالشکور نے ان کا نام لولو اور مرجان رکھا ہے اور لیڈی ڈاکٹر مس ورما نے روشن آرا اور جہاں آرا) کی سالگرہ کرتا آیا ہوں۔ ایک سال یہ اپنے ننیہال تھیں تو میں وہیں گیا تھا۔ اس سال تو ان کی سالگرہ جیل ہی میں ہوگی۔ بچیوں کا نام ان کے پردادا ڈاکٹر عبدالشکور ایل آر سی پی ایل، آر سی ایس (ایڈنبرگ) ایل آر ایف پی ایس (گلاسگو) نے لولو اور مرجان رکھا ہے۔ میرے لئے واقعی یہ لولو اور مرجان ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں حیات دے اور خوش رکھے یہی بہت ہے۔ میں اس کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کروں۔ اس کا کرم بے حساب ہے۔ یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ۝ (رحمٰن آیت ۲۲و۲۳) ذرا اتفاق دیکھئے کہ میرا نام سرور ہے اور میری بیوی کا نام اصغر۔ ایک کے معنی بڑا اور دوسرے کے چھوٹا اور دونوں ہم قافیہ۔ ہم دونوں کے آسمانِ حیات پر ایک تارہ ہے، ایک ستارہ اور ایک ماہ پارہ (ملکہ کا نام ہم نے ماہ پارہ رکھا ہے) سوچتا ہوں اگر ساری زندگی تین بجے صبح سو کر اٹھنے کی عادت لگ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ ایک تو یہ کہ نمازِ فجر کبھی قضا نہ ہو، دوسرے یہ کہ تلاوتِ کلام پاک کا موقع زیادہ ملے۔ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡهُوۡدًا ۝ (بنی اسرائیل آیت ۷۸) تیسری بات یہ کہ اطمینان، خاموشی اور سکون سے زیادہ سے زیادہ کام لکھنے پڑھنے کا ہو سکے۔ سحر خیزی کی نعمتوں سے

جومحروم ہیں وہ بدنصیب لوگ ہیں۔علامہ اقبالؔ نے خدا
سے جوانوں کواپنی آہِ سحر دینے کی آرزو اسی لئے کی تھی۔''

المختصر غلام سرور کی جیل ڈائری ان کی نثر نگاری اور انشاپردازی کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔اس کی نثر میں وضاحت ہے،سادگی وسلاست ہے، برجستگی وشگفتگی ہے۔مصنف کے احساسات وجذبات ہیں اوراس کے فکر کی گرمی وحرارت ہے۔ان میں زندگی سے محبت ہے اوراپنے سماج کے کمزورومظلوم انسانوں کے لئے خدمت اور ہمدردی کا جذبہ ہے۔

اس مضمون میں میں نے غلام سرور کے جن مضامین کا ذکر کیاان کے علاوہ بھی ان کے درجنوں مضامین ہیں جواعلیٰ ادب پاروں میں شمار کئے جائیں گے۔غلام سرور نے اپنے اخبار کے لئے بے شمار اداریے لکھے۔ان اداریوں میں سماج اور ملک کے سلگتے ہوئے مسائل پر انہوں نے بڑی بے باکی اور دانشورانہ فکر کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

میں بڑے دانشوروں اورصحافیوں کے لکھے ہوئے اداریوں اور سنجیدہ مضامین کو بھی ادب پاروں میں شمار کرتا ہوں۔جس طرح ڈائری اور یادداشتوں (Memoirs) کوادب کی صنف تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح میں اداریے کو بھی نثری ادب کی ایک شاخ یا صنف مانتا ہوں۔آخر ابوالکلام آزاد کے وہ مضامین اوراداریے جو''لسان الصدق'' اور''الہلال''و''البلاغ'' کے لئے لکھے گئے آج بھی ادب پارے کے حیثیت سے پڑھے جاتے ہیں۔کون ہے جو ان تحریروں کوادب پارہ ماننے سے انکار کردے؟ غلام سرور نے ہزاروں صفحات لکھے۔ان کی تحریروں (اداریوں) میں ان کا دل دھڑکتا ہے،ان کے سچے جذبات و خیالات جگمگاتے ہیں۔ان تحریروں میں مظلوموں،محروموں اور ستم رسیدوں کے دکھ درد اور ابتلاوآزمائش کی داستان ہے،ایک خاص عہد کے سیاسی واقتصادی حالات کی عکاسی ہے۔اس زمانے کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی چیخ اورصدائے احتجاج ہے جوغلام سرور کی زبانِ قلم سے نکل کرصفحاتِ قرطاس پر بکھر گئی ہے۔ان اداریوں کی حیثیت صرف ہنگامی نہ تھی ان کی حیثیت دستاویزی ہے بلکہ اس سے بڑھ کران کی قدروقیمت اس لئے بھی ہے کہ ہم جب ان کو پڑھیں گے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے اندر قربانی،عزیمت اور زندہ رہنے کا جذبہ پیدا ہوگااور ہمیں کشمکش حیات کا درس ملے گا۔(گوشے میں قفس کے از غلام سرور اشاعت سوم ۲۰۰۱ء،مرتب محمد انعام ظفر شمسی، ناشر غلام سرور مرکز تحقیق، پٹنہ،مقالات غلام سرور، مرتب محمد یونس ہرگانوی، ۱۹۸۳ء، دانش کدہ دریاپور، پٹنہ اور آشرم (خودنوشت) شکیل الرحمٰن، ناشر زرالی دنیا پبلی کیشنز، دریاگنج،نئی دہلی،اشاعت دوم ۲۰۱۱ء سے خصوصی اخذ واستفادہ) ❁❁

غلام سرور :بحیثیت صحافی و قائد

☆ اخبار میں نے بھی نکالا ہے اور دوسروں نے بھی،لیکن صحافت اور صحافی کا نقش جوغلام سرور نے چھوڑا،کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا۔
(سلطان احمد، مدیر اتحاد کا قول بہ روایت حسن احمد، روزنامہ''سنگم'' پٹنہ،سلور جوبلی نمبر ۱۹۸۷ء،ص ۱۴ اک ۸)

☆ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آزادیٔ ہند کے بعد بہار میں غلام سرور کی صحافت وسیاست نے ایک قابل ذکراوراہم رول ادا کیااور وقت کی اُبھرتی ہوئی نئی نسلوں پرایک اثر ڈالا۔اُن کی سرگرمیوں کی وجہ سے نوجوانوں کے اندر ناموافق حالات سے لڑنے کے لئے حوصلہ پیدا ہوا۔بہار کی دوعظیم الشان اردو تحریک کواُبھارنے اور آگے بڑھانے میں ایک مدت تک غلام سرور نے کلیدی اور تاریخی رول ادا کیا۔
(ڈاکٹر عبدالمغنی، بحوالہ غلام سرور نمبر روزنامہ''سنگم''،مشمولہ مجلّہ غلام سرور مرکز تحقیق ۱۹۹۶ء،ص ۳۳)

☆ غلام سرور بنیادی طور پرایک صاحب طرز صحافی، جادو بیان خطیب اور جرأت مند قائد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں اس بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اللہ نے اُن کو بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں اورمنفرد ادبی تنقیدی شعور بھی ودیعت کی تھی......آزادی کے معاًبعد کا وہ دور جب غلام سرور نے اپنی تعلیم مکمل کر کے میدانِ عمل میں قدم رکھا، بڑا ہی پرآشوب اورصبرآزما دور تھا......ایسے میں غلام سرور نے ملک کی تعمیرنو میں حصہ لینا زیادہ ضروری سمجھا ......انہوں نے ادب کی جگہ صحافت کواپنااوڑھنا بچھونا بنالیااور تحقیق وتخلیق کی بجائے تحریکات کی راہ پر چل پڑے۔
(محمد انعام ظفر شمسی، بحوالہ ابتدائیہ بہ قلم مرتب مضامین غلام سرور)

معروف عالم

غلام سرور: ایک مایہ ناز شخصیت

یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان اس دنیا میں آتا ہے اور اپنی حیات مستعار کے شب و روز گزار کر اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتا ہے، لیکن عام اشخاص اور مایہ ناز شخصیات میں بہر حال فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر دوہری موت سے دوچار ہوتے ہیں اور موخرالذکر کی موت ان معنوں میں اکہری ہوتی ہے کہ ان کے کارنامے انہیں مرنے کے بعد بھی عمر دوام بخش دیتے ہیں اور اس کی ایک بالکل سادہ سی ظاہری صورت یہ ہوتی ہے کہ جب ان عظیم شخصیات کی ولادت یا ان کے وصال کی تاریخ آتی ہے تو انہیں جذبہ ممنونیت کے ساتھ انتہائی ادب واحترام سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کے نقوش کار و افکار سے استفادہ کے عزم کا برملا اور بار بار اظہار ہوتا ہے۔

یاد غلام سرور بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، بیشک وہ ہماری علمی و ادبی تاریخ کے ایسے انمول رتن محسوب کئے جانے کا حق رکھتے ہیں جن کی قربانیاں تادیر بھلائی نہیں جاسکتیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس عظیم دانشور اور صحافی کا زمانہ حیات بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی کے آغاز سے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے وسط تک ہے۔ جس وقت ہمارے ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا، اس وقت وہ اپنی زندگی کی اکیسویں بہار میں تھے اور اپنے تعلیمی دور سے گزر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک انقلابی دور تھا اور اس دور کے متنوع مخصوص اثرات نے اُس فعال و سرگرم اور پرجوش نوجوان کو بھی بہمہ جہت متاثر کیا، جسے آج ہم ایک دیدہ ور صحافی حیثیت سے یاد کر رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ صحافت محض کاروبار نہیں بلکہ عبادت ہے اور یقیناً اس میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ غلام سرور نے اپنے عہد شباب میں ایک بہت ہی مستحکم شعوری فیصلے کے بعد، اپنی پوری زندگی اسی عبادت میں بسر کردی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی روشن ہے کہ وہ ایک مخلص تحریک کار اور ایک بلند پایہ ادیب و ناقد کی حیثیت سے بھی نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔

اگر ایک طرف ''نوجوان''، ''ساتھی'' اور خصوصیت کے ساتھ اخبار ''سنگم'' کی دستاویزی فائلیں یہ گواہی دینے کے لئے کافی ہیں کہ انہیں قدرت نے فکر و فن دونوں ہی لحاظ سے صحافت نگاری کا خاص شعور بخشا تھا، ان کی ادارتی تحریروں میں نثر کی شگفتگی، فکر کی جولانی، اظہار پیش کش کی قطعیت، تحریر کی روانی اور زبان کی چاشنی بے مثل ہوتی تھی تو دوسری طرف نقد و ادب کی دنیا میں ان کی کتاب ''پرکھ'' کا مطالعہ بھی یہ بتانے سے قاصر نہیں کہ اپنے عہد کی ادبی سمت و رفتار پر وہ گہری نظر رکھتے تھے، قدرت نے انہیں حالات و مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں علمی و ادبی ماحول و مزاج کے بہترین تجزیے کی صلاحیت بخشی تھی اور وہ صاحب فکر و طرز نقادوں میں واضح مقام کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے ایک بالغ نظر فنکار کی حیثیت سے، ان کی خدمات نے اردو ادب وصحافت اور خصوصاً بہار کی اردو صحافت کو تاریخ ساز فکری و فنی جہتوں سے آشنا بنا دیا۔

قسام ازل نے غلام سرور کو قلم اور زبان دونوں ہی کی بے پناہ قوتوں سے نوازا تھا اور یہ بہت ہی خاص بات ہے کہ ایک طرف اگر انہوں نے قلم کی بدولت اردو صحافت کو اپنی چابک دستی، بے باکی اور بالغ نظری کے جوہر سے فیض یاب بنانے میں کوئی کمی نہیں آنے دی تو دوسری طرف اپنے زور خطابت اور اپنی دوراندیشی و فعالیت سے اردو تحریک کو بھی بطریق احسن نوازتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غلام سرور کی شخصیت صرف ان کی علمیت اور ذہانت سے ہی امتیاز نہیں پاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایثار پسندی اور ان کے اخلاص نے بھی اسے مثالی بنانے میں اہم کردار

ادا کیا ہے۔حصولِ آزادی اوراس کے آس پاس کا زمانہ کچھ ایسا تھا کہ اگر غلام سرور جیسا ایک باصلاحیت اور ذہین نو جوان چاہتا تو اپنے دیگر متعدد ساتھیوں کی طرح اپنے لئے روشن مستقبل کی عام سی راہ تلاش کرلیتا اورنقد وادب کے میدان تدریس سے اپنی معاشی وابستگی بنالیتا۔ اس وقت سرحد پار کی دنیا بھی کھلی تھی اور ایسے نوجوانوں کی آمد کے لئے سراپا منتظر تھی جو متنوع صلاحیتوں کے مالک ہوں اور اگر غلام سرور کی تنقیدی وادبی صلاحیتوں کو دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لئے خالص ادبی صحافت کی طرف آ کر بھی اپنا شوق پورا کرنا کچھ دشوار نہ تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ انہیں اس وقت کے ماحول میں ملک وملت کے پرسکون مستقبل اور ان کی تعمیر نو سے بہت ہی خاص دلچسپی تھی اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے روزنامہ نگاری کو ایک اہم اور بہت ہی موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔

غلام سرور کو اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں پر پورا پورا بھروسہ تھا اور انہوں نے اپنے اساتذہ ادب سے جو کچھ سیکھا تھا، اس کا فیضان صحافت کی دنیا میں بہ انداز نو عام کرنا چاہتے تھے،انہیں یہ سبق بھی یاد تھا کہ ارض بہار کے ہمہ نوع ثقافتی سرمایہ کے تحفظ اور اس کے مرتبہ کو اجاگر کرنے کی کاوشیں ہونی چاہئیں اور انہیں یہ بات بھی یاد تھی کہ حق بات کسی مرعوبیت کے بغیر دوٹوک کہنی چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ان اسباق کے ثمرات سے صحافت کو عملاً فائدے پہنچانے کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور نہ صرف یہ کہ اس کی اعلیٰ فکری قدروں کا ہمیشہ پاس ولحاظ رکھا بلکہ اس کے مخصوص فنی اقدار کی طرف بھی ہمیشہ ہی ان کی توجہ رہی۔

غلام سرور نے اپنے عہد شباب میں اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ آزادی کی جنگ میں خصوصیت کے ساتھ اردو صحافت نے کس قدر بلند، مؤثر اور فاتحانہ کردار ادا کیا تھا، اس مشاہدے کے بموجب، وہ صحافت کی قوت وتاثیر کا پورا پورا احساس رکھتے تھے اورانہیں اس بات کا بھی پورا پورا یقین تھا کہ آزادی کے بعد جو صورت حال ابھری ہے اس میں جائز حقوق کی طلب کے لئے صحافت کا راستہ اپنانا کسی بھی حال میں بےثمر نہیں ہوسکتا۔

صحافت جمہوریت کا ایک ستون ہے اور اس میں یقیناً دورائے نہیں ہوسکتی کہ غلام سرور نے اس ستون کو بیش از بیش مستحکم اور مفید مطلب بنانے کی کاوشوں میں ہرقسم کی محنتوں اور قربانیوں سے کام لیا۔ وہ بار بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، لیکن انہوں نے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ آزادی کے بعد کی ''زندانی صحافت'' میں اگر کوئی نام سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے تو وہ اسی صحافی کا نام ہے جسے دنیا غلام سرور کہتی ہے۔

عموماً اپنے فن پر فن کار کو ناز ہوتا ہے، لیکن غلام سرور اپنے میدانِ عمل میں ایک ایسے اہم اور مثالی فن کار کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر صحافت کا فن کل بھی نازاں تھا اور آج بھی نازاں ہے۔ بلاشبہ جب آزاد ہندوستان میں اور خصوصاً ارض بہار کے حوالے سے اردو روزنامہ نگاری کی منصفانہ تاریخ لکھی جائے گی تو مورخ ان کی خدمات کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ یاد کرے گا۔

غلام سرور کو اگر صرف ایک سیاست داں اور ایک تحریک کار

صحافت اور صحافی

☆ صحافت عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی صحیفہ نگاری کا فن ہے۔ انگریزی لفظ جرنلزم کا ماخذ بھی لاطینی لفظ Journal ہے۔ صحیفہ اور Journal ہم معنی مماثل الفاظ ہیں۔ صحافت اطلاعات کی فراہمی اور ان کی ترسیل، توسیع تبلیغ، نشر واشاعت کا فن ہے اور اس فن کے معیار کو پرکھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ صحافی نے اپنی تبلیغ کو کامیابی کے ساتھ کوچہ وبازار، گلی گلی، گھر گھر، دوکان دوکان، دفتر دفتر اور ہوٹل، کلب، اسکول، کالج، یونیورسٹی تک پہنچایا یا نہیں؟ صحافی کو دنیائے سیاست کا حریف کہا گیا ہے جس کی کسوٹی وہ ہے جو اصولوں اور قدروں کو پرکھے اور جس کے پیمانے اور بکھرے حوادث کو تولنے کا کام کرسکیں۔ وہ تو اس پیچیدہ مسائل اور اختلافات سے بھری دنیا میں بھی عدل وانصاف کی عدالت کے جج کی طرح کرسی جما کر بیٹھتا ہے اور فریضہ انصاف ادا کرتے ہوئے ہر موضوع، ہر حادثہ، ہر واقعہ پر اپنا دوٹوک فیصلہ صادر کرتا ہے۔ وہ بیک وقت سماج اور قوم بلکہ انسانی برادری کا رہنما، ناصح، معالج، وکیل اور مشیر ہوتا ہے۔ (بہار میں موجودہ اردو صحافت کا معیار، غلام سرور، روزنامہ ''سنگم'' سلور جوبلی نمبر ۱۹۸۷ء، ص۳)

قرار دے کر بات ختم کی جائے تو یہ یقیناً قرین انصاف روش نہیں ہوگی کیوں کہ انہوں نے جہاں ایوان سیاست میں اپنے تدبر کے نمونے پیش کئے اور تحریکات کی دنیا میں اپنے ایثار واخلاص کے صدہا جلوے دکھائے، وہیں خصوصیت کے ساتھ اردو صحافت کو بولنا اور اپنی زندگی و توانائی کا ثبوت دینا بھی سکھایا۔ غلام سرور کا یہ تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ آزادی کے بعد کی ابتدائی دہائیوں میں انہوں نے اس وقت کی ابھرتی ہوئی نسلوں کو ایک خاص اعتمادی ذہن بخشا اور انہیں قلم کے ذریعہ ناموافق حالات سے لڑنے کے حوصلے بھی دئے اور اس کی خاطر جمہوریت پسندانہ سلیقے اور طریقے بھی بتائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصری تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے غلام سرور نے جذبوں کو خوابیدہ ہونے سے بچایا اور اپنی صحافتی آواز سے جمہوری حقوق پر عوام کا اعتبار بڑھایا۔ ان کے خطبات ہوں یا ادارتی شذرات، بہر حال وہ ہمارے لئے متاع گراں بہا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے روشنی لے کر ہم آج بھی اپنے لئے عصری تناظر میں بہت سارے مفید مطلب نکات اخذ کر سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے ادبی مقالات سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے یہاں تنقید کی سنجیدگی بھی تھی اور بیداری بھی۔ ادب ہو یا صحافت، بہر حال انہوں نے فکر وفن کو نئی معنوی جہات دینے میں خاموش، مگر بڑا ہی اہم اور تاریخ ساز رول ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ادب وصحافت اور عصری وانسانی زندگی کے رشتوں کو عالمی تناظر میں دیکھا اور دکھایا، بلکہ ہمیشہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کاوشوں میں مصروف رہے۔ قدرت نے انہیں تحریر وتقریر کی جو صلاحیت دی تھی، اسے انہوں نے ملک وملت اور خصوصیت کے ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی وآبیاری کے لئے نہایت فراخ دلی، ژرف نگاہی اور عصری نباضی کے ساتھ بروئے کار لایا۔

صحافت کو ارتجالی ادب کہا گیا ہے اور اسی لحاظ سے صحافی کی تحریریں خالص ادبی وانتقادی تحریروں کے زمرے میں نہیں رکھی جاتیں، لیکن غلام سرور کا یہ امتیاز ہے کہ ان کے صحافتی تبصرے، رپورتاژ اور ادارتی کالموں سے ماخوذ بہت سارے اقتباسات، ان کے صاحب اسلوب فن کار ہونے کا کھلا احساس دلا جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایک طرف انہوں نے اپنی تجزیاتی وتنقیدی صلاحیت سے اردو صحافت کا دامن وسیع کیا ہے تو دوسری طرف اپنے حسن سبک سے انہوں نے یہ شان بھی پیدا کی ہے کہ ان کی تحریروں کے بیشتر ٹکڑے، خوبصورت ادبی انشا پردازی کے ذیل میں بلا تکلف رکھے جاسکتے ہیں اور آج تقریباً چھ دہائی کے فاصلے سے بھی ان کی شگفتگی محسوس کی جاسکتی ہے۔

یہاں چند باتیں محض خراج عقیدت کے طور پر زیب قرطاس ہوسکی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غلام سرور کی ادبی وصحافتی زندگی اہل ذوق کے مطالعہ کا وسیع موضوع ہے اور اس کے مختلف پہلو پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بہار کے اس مایہ ناز سپوت کی باقیات میں ہمارے لئے جو قیمتی اور مفید عصر نکات پنہاں ہیں اور ان میں زندگی اور زمانے کے لحاظ سے عزم وحوصلہ کا جو پیغام نمایاں ہے، اسے مخلصانہ احتیاط واحترام کے ساتھ بروئے کار لایا جائے۔ (ماخوذ از ماہنامہ ''زبان وادب'' ج ۳۵ ش ا ص ۵) ❀❀

پرکھ سے دو اقتباس

☆ ہم اگر تاریخ ادب کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ کسی زبان یا ملک کا ادب ہمیشہ کسی ایک منزل پر قائم نہیں رہا۔ فرد کی تربیت اس کا ماحول کرتا ہے اور افراد، جماعت کی تنظیم وتشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ فرد کو جماعت سے اور جماعت کو فرد سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ افراد کی مثال خام مواد کی سی ہے اور جماعت ان خام مواد سے تعمیر کردہ عمارت ہے۔ آئیڈیل سوسائٹی کے لئے افراد کی ترقی اور اُن کا آئیڈیل ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک بڑا آرٹسٹ اپنے ذہن میں تاریخ انسانی رکھتا ہے اور اپنے زمانے کے ماحول سے اثر قبول کرتا ہے۔

☆ مورخ، بلکہ ایک ایماندار مورخ وہ ہے جس کی آنکھوں پر کوئی ایسی عینک نہ ہو، جس سے وہ چند چیزوں کو دیکھ سکے اور دیگر اشیا کے دیکھنے سے قاصر ہو، جس سے اسے کچھ چیزیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہوں اور دوسری چھوٹی۔ اس کے ذہن پر کوئی ایسا پردہ نہ ہو، جس سے کوئی بات یا واقعہ اپنے صحیح روپ میں دماغ کے اندر سرایت نہ کر سکے اور پردہ کا رنگ جذب کرتے ہوئے مورخ کے دماغ میں داخل ہو۔ (پرکھ، بحوالہ مقالاتِ غلام سرور، ص ۲۰۳ و ص ۱۳۹ سے ماخوذ)

مقالات

ڈاکٹر داؤد احمد
Asstt. Prof. Dept. of Urdu, F.A.A. Govt. P.G. College, Mahmudabad
Sitapur - 261203 (U.P.) (Mob. 8423961475)

حیرتؔ داؤدنگری: حیات وشاعری

داؤدنگر زمانہ قدیم سے ہی بہار کا ایک مردم خیز خطہ اور گہوارۂ علم وفن رہا ہے۔ دبستان عظیم آباد کے ادبی مراکز گیا، جہان آباد، شیر گھاٹی (حمزہ پور) اورنگ آباد، ہسپورہ (امجھر شریف) کی طرح داؤدنگر کی بھی اپنی ایک منفرد ادبی تاریخ ہے۔ عہد قدیم سے موجودہ زمانے تک اس نے مختلف ادوار اور شعبۂ حیات میں عبقری اور لائق احترام شخصیتیں پیدا کی ہیں جن کے علم وکمال اور ادبی وشعری خدمات نے ماضی میں اس شہر کا نام روشن کیا اور آج بھی اس شہر کا نام روشن ہے۔

داؤدنگر کی قابل ذکر شخصیتوں میں اگر ایک طرف دنیائے ادب کے مشہور طنز ومزاح نگار اکبرالہ آبادی کا نام نامی شامل ہے۔ ان کی پیدائش داؤدنگر میں ہوئی، وہ بعد میں صوبہ اتر پردیش کے مردم خیز علاقہ الہ آباد میں جا کر مقیم ہو گئے اور ان کے علاوہ مولانا منظور حسین، علامہ سید شاہ انیس قادری، مولانا محمد حنیف عزیزی، محمد فاروق احمد قمر مخدومی، سید شاہ رشید احمد قادری، حافظ محمد اسمٰعیل انصاری، مجاہد آزادی شوکت علی انصاری، حافظ محمد حنیف قریشی اور معین الدین قریشی وغیرہ کے نام روشن ہیں تو دوسری طرف دور حاضر میں علامہ صابر قادری، حافظ مختار احمد انصاری، پروفیسر عبدالرشید صدیقی، پروفیسر محمد مختار انصاری، ڈاکٹر بختیار نواز، ڈاکٹر عبدالقدوس جوہرؔ، ڈاکٹر اعجاز داؤدنگری اور ساحرؔ داؤدنگری کی ذات گرامی بھی اپنے اپنے میدان فکر وعمل میں سرگرم نظر آتی ہے۔

یہ دنیا کا اصول ہے کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ ذہنی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ علم اور مناسب تربیت کے باعث ان کو پروان چڑھاتا ہے اور ان ہی کی بنیاد پر اپنی ایک الگ شناخت بناتا ہے۔ عظیم شخصیتوں میں ایک بات نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ ایسے لوگ ہر معاملہ میں عام لوگوں سے مختلف واقع ہوتے ہیں۔ ایسی شخصیتیں خلوت کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ محنت، لگن اور جدو جہد سے بس کارنامے انجام دیئے جانا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں ایک پروقار شخصیت حیرتؔ داؤدنگری کی بھی ہے۔

حیرتؔ داؤدنگری نے ۲؍جنوری ۱۹۲۹ء کو صوبہ بہار کے مردم خیز تاریخی خطہ داؤدنگر میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد ماجد محمد نور خلیفہ تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم رسم ورواج کے مطابق مکتب میں ہوئی۔ داؤدنگر میں ہی انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہرام میں داخل ہوئے اور وہاں سے فضیلت کی سند لی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۷ء تک شنکر ہائی اسکول آغانور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

حیرتؔ داؤدنگری شعروادب میں کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ بغیر استاد کے وہ موزوں شعر کہتے تھے۔ لوگوں کو اس بات پر حیرت بھی ہوتی تھی غالباً یہیں سے ان کا تخلص ''حیرتؔ'' پڑ گیا اور وہ حیرتؔ داؤدنگری کے نام سے اپنے علاقے میں پہچانے جانے لگے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ تمام عمر نہایت خاموشی سے اردو زبان وادب کی خدمت میں مشغول رہے۔ وہ تمام عمر اجنبی فضا میں رہے۔ ان کی اپنی دنیا تھی، وہ درویش صفت انسان تھے گمنامی میں ہی پیدا ہوئے اور گمنامی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

حیرتؔ داؤدنگری ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ انہیں شعروادب کا ذوق طالب علمی کے زمانے سے ہی تھا۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ زبان وبیان پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ان کا انداز غزل کلاسیکی غزل کا تھا۔ ان کی شاعری عشق اور عشق کے پاکیزہ جذبوں سے لبریز ہے۔ ان کے یہاں حسن کا احترام ہے، رومان پرور فضائیں ہیں، اس کے علاوہ ہجر ووصال کے دکھ اور سکھ ہیں۔

حیرتؔ داؤدنگری کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے صرف

حسن وعشق کے جذبات کو ہی اپنے اظہار کا موضوع نہیں بنایا بلکہ ان کی شاعری عام انسان کے دکھ درد سے بھی وابستہ ہے۔ان کے یہاں انسانی دردمندی اور بھائی چارگی کے احساسات بدرجہ اتم موجود ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں ۔

یوں ہی رونے سے فائدہ کیا ہے
جب تری چشم دیدہ ور نہ ہوئی

جب سے محبوب کا دل میں گھر ہوگیا
دل مرا تب سے جانے کدھر ہو گیا

ناکامیوں کے داغ ہمارے جگر میں ہیں
جتنے فریب تم نے دیے سب نظر میں ہیں

ہے کتنی اضطراب کی لذت سکون بخش
اچھا ہوا کہ آہ کی تاثیر دیکھ لی

حیرتؔ داؤدنگری کی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اگر ایک طرف موضوعات کی رنگارنگی ہے تو دوسری طرف اظہار خیال کا بانکپن بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کے یہاں تخلیقی اکائیاں تجربے کی آنچ میں تپ کر ہی منصۂ شہود پر آئی ہیں،موضوعات میں ایک طرح کا تنوع اور اظہار وبیان میں حد درجہ پختگی ہے۔

حیرتؔ کی شاعری دراصل فطری شاعری ہے۔شہر داؤدنگر میں اردو شاعری کے پہلے دور میں جو حضرت انیس احمد قادری اور سید خان بہادر وغیرہ کا دور تھا،آپ نے اپنی شاعری کی شروعات کی۔شاعری کے دوسرے دور میں بھی جو سید شاہ حماد احمد صابرؔ قادری،قمرؔ مخدومی،معین الدین کوثر،سالمؔ داؤدنگری وغیرہ کا دور تھا، جناب حیرتؔ کو طبقۂ شعرا میں مرکزیت حاصل رہی اور اس کے بعد تیسرے مجریہ دور میں جو ساحرؔ وکوثرؔ اور جوہرؔ وغیرہم کا دور ہے،حضرت حیرتؔ کا استادانہ مرتبہ روشن رہا۔

حیرتؔ داؤدنگری کیکلام کا مطالعہ بتا تا ہے کہ ان کے یہاں تخلیقی قوت کا اظہار نہایت سلیقے کے ساتھ ہوا ہے۔ان کی شاعری میں مناظر قدرت کے جلوے بھی ہیں،عہد حاضر کے مسائل بھی اور کلاسیکی رچاؤ کا سلیقہ بھی۔ان کی غزل کا دامن کہیں بھی تنگ نظر نہیں آتا بلکہ وسیع سے وسیع تر لگتا ہے،اس کی وجہ ان کا عمیق مطالعہ اور باریک بینی سے کائنات کا مشاہدہ ہے جو ان کے کلام میں بہت سی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ان کا غزل پڑھنے کا انداز بھی بالکل منفرد تھا اور خصوصاً ضعیفی میں بھی جب اپنے مخصوص انداز میں وہ ۔

جب مقابل ہو وہ حسن جاناں
کس طرح کوئی دامن بچائے
لگ نہ جائے کہیں آگ دل میں
اس سے کہہ دو نہ چلمن اٹھائے

ادب ہے گھر میں نہ تہذیب ہے قبیلے میں
اب آگئے ہیں یہ کیسے نئی صدی کے دن

جیسے اشعار پڑھتے تو سامعین خصوصاً نوجوان واہ واہ کی صداؤں سے مشاعروں کو سر پر اٹھالیتے اور پھر حیرتؔ کی کیفیت واقعی دیدنی ہوتی۔

حیرتؔ کی شاعری بتاتی ہے کہ وہ اس فن شریف سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں،معاشرہ پر بہت تیکھے وار کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں عام انسان کے مسائل ہیں جسے وہ شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔صداقتوں کے انکشاف میں اگر معاشرہ ان کے خلاف بھی ہوجائے تو انھیں اس بات کا کوئی غم نہیں ہوتا ۔

صداقتوں کا ہمیں انکشاف کرنا ہے
کہے وہ جھوٹ تو اس کو خلاف کر نا ہے

بقول عمران عظیم:

''حیرتؔ داؤدنگری کا شماران بزرگ شعرا میں ہوتا ہے جن کے یہاں شعری روایت کا احترام جابجا دیکھنے کوملتا ہے۔ان کی شاعری میں حسن وعشق کی چاشنی بھی ہے اور ہجر ووصال کی چمک بھی۔انھوں نے شعری منظر نامے میں اپنے کلاسیکی شعور کو بدستور قائم ودائم رکھا ہے۔ان کے کلام میں پاکیزگی کی آہٹ اور انسانیت کے جذبے کا شعور سننے کوملتا ہے جو کانوں کو اچھا لگتا ہے اور دل و دماغ کو شاداب کرتا ہے۔ان کے کلام میں رومانیت کی

جھلک بھی ہے اور باہمی رشتوں کا احساس بھی۔ یہ عام
انسان کے دکھ درد کو سمجھ کر شاعری میں ڈھال دیتے ہیں۔''
(حیرتؔ داؤدنگری: فن اور شخصیت، ص ۷)

حیرتؔ داؤدنگری کے اشعار غم کے گہرے احساسات سے آراستہ ہیں۔ زندگی کے ہیجانات کی شدید کشمکش اور اس کے اظہار کو حیرتؔ داؤدنگری نے ایک خوبصورت لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کے اشعار دل کی دھڑکن بن کر پردۂ سماعت سے ٹکراتے ہیں اور تحت الشعور کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرتے ہیں۔ حیرتؔ داؤدنگری کا طرز تحریر اور اسلوب بیان خالص ان کا اپنا ہے۔ وہ کسی بھی چیز کا گہرائی سے مشاہدہ یا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اسے شعری جامہ پہنادیتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق کا تصور ایک زندہ متحرک قوت کی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں ان کے یہاں غم دوراں کا تصور ہے، وہیں غم جاناں کی تصویر بھی صاف طور پر نمودار ہوتی ہے ؎

جب ہوا وصل الفت جدا ہوگئی
یہ مرے عشق کی انتہا ہوگئی

ان کی الفت فریب ہے حیرتؔ
پھر بھی سب کچھ لٹائے جاتا ہوں

حیرتؔ مجھے نصیب ہوا وصل یار جب
میں نے تو اپنے عشق کی توقیر دیکھ لی

حیرتؔ داؤدنگری میں شعرگوئی کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں، مگر وہ ضرورتاً ہی شعر کہا کرتے تھے اور عام طور پر عوامی پسند اور ذوق کو مدنظر رکھ کر شاعری کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں سادگی اور جذبے کی شدت زیادہ ہے۔ حیرتؔ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور بات کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ اخلاق ومحبت، دوستی ورواداری، ہمدردی و شرافت ان کی شخصیت کا جوہر تھی۔ ہر مکتبہ فکر کے لوگ ان کا احترام اور ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کے دوستوں، قدردانوں اور ملاقاتیوں کی تعداد اس لحاظ سے بہت زیادہ تھی کہ وہ عوامی شاعر تھے اور اپنی آواز اور سخن سازی دونوں کے ذریعے انہوں نے بڑی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں حیرتؔ داؤدنگری کی شرکت ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ حقیقتاً وہ مشاعرے کی جان ہوا کرتے تھے۔ وہ حساس طبیعت کے مالک تھے اور اپنی خوش طبعی میں ایسے ممتاز کہ رنجیدہ اور غم زدہ انسان بھی ان کی محفل میں آ کر خوش مزاج اور شگفتہ ذہن کا ہوجاتا تھا۔ وہ مترنم آواز میں اپنے اشعار پڑھتے تھے اور محفل کو لوٹ لیتے تھے۔ ان کی مسحور کن آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے اور آج بھی اہل ذوق حضرات ان کے اشعار گنگناتے ہیں۔ ان کے کلام میں سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ فصاحت بھی پائی جاتی ہے ؎

دل کو مرنا قبول لگتا ہے
اب تو جینا فضول لگتا ہے

بات بھی میری رات بھر نہ ہوئی
بات کی ہم نے بات پر نہ ہوئی

پھول مرجھا کے سوکھ جائیں گے
باغباں گر تری نظر نہ ہوئی

حیرتؔ داؤدنگری کی شاعری کے جو نمونے ملے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شعر وادب کے بدلتے تیوروں سے خاصا اثر قبول کیا ہے۔ وہ منفرد تحرک انگیز کیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری جذبات اور احساسات کی ایک کھلی کتاب ہے جس میں ان کی زندگی اور شخصیت کے روشن گوشوں کا باآسانی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ۱۱رمئی ۱۹۹۴ء کی شب ادب کا وہ روشن ستارہ جسے حیرتؔ داؤدنگری کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا، ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ ❀❀

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

ڈاکٹر احمد علی خان

Lecturer, Deptt. of Persian, Sham Nand Sahai College,
Muzaffarpur (Mob. 9661561420)

فروغ فرخزاد: فارسی کی ایک انقلابی شاعرہ

فروغ فرخزاد جدید فارسی شاعری میں بین الاقوامی شہرت کی حامل شاعرہ گزری ہیں جو ۱۹۳۵ء میں تہران میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۶۷ء میں صرف بتیس سال کی عمر میں ایک کار حادثہ میں موت سے ہم کنار ہو گئیں۔ اس شاعرہ کی ابتدائی زندگی کے احوال خود انہیں کی زبانی ملاحظہ کریں:

> ''میری زندگی کے ستائیس سال یوں ہی ضائع ہو گئے کسی نے صحیح ڈھنگ سے میری تربیت نہیں کی، نہ مجھے کچھ بتایا سکھایا، نہ میری رہنمائی کی، نہ مجھے زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ سولہ سال کی عمر میں ایک احمقانہ محبت اور شادی نے میری زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا جس کا انجام طلاق پر ہوا، میرا اکلوتا بچہ بھی مجھ سے چھن گیا، لیکن میں حوصلہ نہیں ہاروں گی۔ از سر نو زندگی شروع کروں گی، وطن سے محبت کروں گی، عوام سے محبت کروں گی، اپنی ماؤں بہنوں کا درجہ بلند کروں گی۔''

اور واقعی فروغ نے اپنی مختصر زندگی میں ایسا کر دکھایا۔

فروغ پر اردو کی عصمت اور واجدہ تبسم کی طرح اگرچہ عریانی و فحاشی کے الزام بھی عائد کئے گئے، لیکن انہوں نے زنانہ احساسات کو بے پردہ اپنی شاعری کا موضوع بنانے میں کبھی کوئی کسر نہیں رکھا۔

ان کی یہی آزادانہ روش اور اظہار گناہ کی جسارت ان کے اکثر ہم وطنوں کو گراں گزری۔ ان کے پہلے دور کی شخصی، جذباتی شاعری بھی آفاقی احساسات کی ہی شاعری ہے، آخری دور کی شاعری تو بالکل ہی آفاقی ہے۔ ان کا اضطراب عشق ان کی آرزوئیں، اس کے جذبات حسرتیں، ان کے خواب صرف ایک فرد کے خواب نہیں، میرے آپ کے سب کے خواب ہیں۔ یہ سنہرے کل کا خواب ہے کہ کوئی شہزادہ، کوئی راجہ، کوئی شخص جو دنیائے منفرد سے آئے گا اور اُسے شہر غم سے بہت دور لے جائے گا اور لوگ حیرت سے دیکھتے رہ جائیں گے۔

فروغ کے یہاں پہلے دور کی شاعری میں ہمیں ایک تنہا عورت کی جو اُداس، افسردہ تصویر دکھائی دیتی ہیں۔ وہ صرف ایک تنہا عورت کی تصویر نہیں بلکہ اس دنیا کے ہزاروں راندۂ درگاہ پژمردہ خواتین کی تصویریں ہیں جو ہر ملک، ہر سماج میں دکھائی دیتی ہیں۔ فروغ اپنے ذاتی غموں کو بھی اس طرح بیان کرتی ہیں کہ اس کے آئینہ ہیں ہمارے آپ کے غم بھی متشکل ہونے لگتے ہیں۔ مردوں کی دنیا میں عورت ہونے کے ناطے قدم قدم پر جن مخالفتوں اور رسوائیوں کا انہیں سامنا کرنا پڑا ان کا بڑی حوصلہ مندی سے انہوں نے ہمیشہ مقابلہ کیا۔ ان کے اندر جھنجھلاہٹ اور تلخی پیدا نہیں ہوئی، بلکہ زاہدوں پر انہوں نے یوں خوب خوب چوٹ کی ؎

نامِ خدا نہ بردن ازآن بہ کہ زیر لب
بہر فریب خلق بگوئی خدا خدا

یعنی خدا کا نام نہ لینا اس سے بہتر ہے کہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے زیر لب خدا خدا بدبدائیں، ان کا عقیدہ اور ان کا خواب تھا کہ عقل و آگاہی کی زندگی بسر کریں، زندگی سے فرار نہ کریں، اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ ایسا ہی انہوں نے خود بھی کیا، اپنی شاعری میں انہوں نے خود کو اور دنیا کو پہچانا اور نئے تصور کی زندگی شروع کی۔ حادثہ نے انہیں تو مٹا دیا، لیکن ان کی ادبی میراث کو کوئی حادثہ نہیں مٹا سکتا۔

جدید فارسی شاعروں کی ایک ممتاز خصوصیت معاشرتی مسائل پر خاص توجہ ہے۔ ادبیات قدیم میں بھی شاعروں کی توجہ معاشرتی مسائل پر رہی ہے، لیکن ان میں ادبیات جدید ایسی وسعت نہیں رہی ہے۔

جدید شاعرہ فروغ فرخزاد خاص طور سے اپنے دور کے

معاشرتی مسائل کے متعلق ایک حساس نظریہ اور تنقیدی نگاہ رکھتی ہیں۔ ایک اہم موضوع ان کی شاعری کا وہ قوانین ہیں جو خاص طور پر عورتوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔ وہ کبھی ایک گنہگار اور سرکش عورت کے مقام پر ہوتی ہیں اور کبھی ایک روشن فکر جدید اور ترقی پسند خیال کی مبلغ، وہ کسی طرح تیار نہیں کہ عام ایرانی عورت پر کسی طرح کے ظلم کو برداشت کرسکیں۔ اگر سیاسی قانون ان پر کوئی ظلم کرتا ہے تو وہ مقابلہ کے لئے اپنی شاعری کا ہتھیار لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایسے قانون کی سخت مخالفت کرتی ہیں۔ وہ ایک خط میں جو آہواز سے کسی میگزین کے لئے لکھا گیا تھا، وہ کہتی ہیں کہ میری آرزو ایران کے عورتوں کی آزادی اور مردوں کے برابر ان کے حقوق کی پیروی ہے۔ میں ان تکلیفوں اور اذیتوں کی جو میری بہنیں اس ملک میں مردوں کی ناانصافی کی وجہ سے برداشت کرتی ہیں، کبھی بھی طرفدار نہیں۔ میں ان کے دردوں اور غموں سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور اپنے فن کا نصف حصہ میں ان ہی دردوں اور غموں کے اظہار میں صرف کرتی ہوں۔

فروغ فرخزاد اپنی کچھ نظموں میں عورتوں کے تئیں مردوں کی بے وفائی کا تذکرہ کرتی ہیں اور شدید خواہش مند ہوتی ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ بالکل ویسا ہی سلوک کریں، ان کے قلم کی اینٹ کا جواب بے وفائی کے پتھر سے دیں۔ وہ اپنی ایک خوبصورت نظم ''فتح باب'' میں کہتی ہیں شادی کا مطلب صرف میاں بیوی کے رشتے میں رسماً بندھ جانا نہیں ہے۔

فروغ نے جس ملک کا بھی سفر کیا وہاں کی طبقاتی نابرابری کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وہ یورپ کے سفرنامے میں اٹلی کے سرمایہ دار طبقہ اور غریب ومفلوک الحال عوام کی سماجی نابرابری کے متعلق لکھتی رہیں اور بتایا کہ صرف اس سفر میں ہی ممکن ہوسکا کہ میں اٹلی کے لوگوں کی اصلی زندگی کا مشاہدہ نزدیک سے کروں۔ وہاں کا معاشرہ بھی بہت حد تک ہمارے معاشرہ کی طرح ہے۔ وہاں بھی طبقاتی اختلاف دیکھنے کو ملے۔ امیر وسرمایہ دار طبقہ کی زندگی کو عوام کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ فروغ نے اپنے یورپ کے سفرنامے میں ہی اپنے آخری نظم میں امام خمینی کے آنے کی پیشین گوئی کردی تھی ''کسی می آید کسی کہ مثل او ہیچ کس نیست'' انہوں نے اپنے اس سفرنامے میں اٹلی کے مذہبی حالات اور توہم پرست عوام کی تصویر کشی کی اور ایران کے حالات سے اُسے بالکل ملتا جلتا قرار دیا وہ بتاتی ہیں کہ:

> ''اٹلی میں مذہب عوام کے درمیان اپنی بالکل گری ہوئی شکل میں حکومت کرتا ہے۔ ایران میں میں نے خالہ خان باجیوں کو ملا کے پاس دعا، تعویذ کے لئے جاتے دیکھا تو میں نے ان کا مذاق اڑایا، مگر اٹلی میں بھی ایسے نوجوانوں کو دیکھا جو اپنے سارے درد کی دوا وہاں کے پوپ کو سمجھے ہوئے تھے اور ان کو تبرک سمجھتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارے ایرانی خان باجی حضرات جاہل تھیں اور اٹلی کے پوپ پرست سبھی روم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔''

پھر انہوں نے ایک نظم لکھی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

میں نے خواب دیکھا ہے کہ کوئی آرہا ہے
میں نے خواب میں ایک سرخ ستارہ دیکھا ہے
میری پلکیں پھڑ پھڑا رہی ہیں
اندھی ہو جاؤں اگر جھوٹ کہوں

وہ اپنی شاعری میں اکثر ایسے مردوں سے پوچھتی ہیں کہ کبھی تم نے اپنے اس ہیچ حال پر غور کیا ہے کہ تم سوائے ایک زندہ لاش کے کچھ نہیں ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ تم اپنے چہروں پر غم انگیز زندگی کا لباس چڑھائے ہوئے ہو کبھی اس غم انگیز حقیقت پر غور کرتے ہو کہ تمہاری موجودہ زندگی ایک زندہ لاش کے سوا کچھ بھی نہیں۔

فروغ فرخزاد وزیروں اور امیروں کی پرعیش اور بے فکری کی زندگی سے سخت نالاں ہیں اس لئے کہ انہوں نے خود غریبی کا تلخ مزہ چکھا ہے۔ اپنے بھائی کو ایک خط میں وہ لکھتی ہیں:

> ''شدید سردی کا موسم ہے اس وقت میرے پاس انگیٹھی بھی نہیں ہے اور نہ پیسے ہیں۔ اکثر ہر مہینے کا آدھا حصہ اس طرح گزرتا ہے کہ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا اور کوئی بھی ایسا امیر وزیر یا دولت مند نظر نہیں آتا جسے میرے حال پر رحم آئے اور میری مدد کرے۔ میں

دس سال سے شاعری کرتی ہوں، مگر جب پچاس روپے کی
بھی ضرورت ہوتی ہے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہوں اور دل
چاہتا ہے کہ خوب روؤں، لیکن پھر اپنے آپ پر کنٹرول
کرتی ہوں۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اندر
حوصلہ پیدا کرتی ہوں اور روشن مستقبل کی امید کرتی ہوں کہ
کبھی تو حالات بدلیں گے، میری زندگی میں نہ سہی،
میری بہنوں، میرے بھانجے بھانجیوں، پوتے پوتیوں
کسی کو بھی تو عزت وآزادی کے دن دیکھنے کو ملیں گے۔''

یہ حال ہے عالمگیر شہرت کی حامل ایران کی ایک شاعرہ کا، گرچہ فروغ فرخزاد کا ایک کار حادثے میں کم عمری میں ہی انتقال ہوگیا، لیکن ان کی قیمتی میراث نے مردوں اور عورتوں کے اندر ایک انقلاب برپا کردیا۔ سبھی اپنے حالات کو بدلنے کی فکر میں لگ گئے، خمینی جیسا انقلابی لیڈر مل گیا اور آخر کار ایران سے بادشاہت کو جڑ سے ختم کردیا گیا اور وہاں ظلم وجفا سے پاک اسلامی اور انسانی حکومت قائم ہوگئی۔ خمینی اور ان کے پیروکاروں کے اقدام کو ساری انصاف پسند دنیا نے سراہا۔ فروغ نے اس حوالے سے کہا ہے ؎

ہمہ می ترسند اما من و تو
بہ چراغ و آب و آئینہ بپیوستیم

یعنی وہ قانون اور نام نہاد انصاف کے فرشتے سے خوش نہیں ہیں۔ قانون نے ہمیشہ ان کو اپنی دوسری ہم جنس عورتوں کی طرح محکوم اور غلام سمجھا ہے۔ ان عوتوں کی جنگ آزمائی قانون کی طاقت کے سامنے شکست سے ہمکنار ہوجاتی ہے ان تمام مظالم کی ڈھال وہ عشق صادق کو سمجھتیں ہیں باہری دنیا کے ٹینشن کو وہ اپنی باطنی دنیا میں دبا دیتی ہیں۔ وہ اپنے یورپ کے سفرنامے میں رقم طراز ہیں:

''زندگی کے ٹینشن کا ماحول اور ان زنجیروں کے دباؤ کا
جنھوں نے ہمارے ہاتھ پیر باندھ رکھے ہیں۔ بڑے
استقلال اور ہمت سے مقابلہ کرتی ہوں ان کے سامنے
اپنی تمام طاقت کے ساتھ ڈٹ کر کھڑی ہوجاتی ہوں،
جنھوں نے مجھے مجبور اور پریشان کر رکھا ہے۔ میں چاہتی
ہوں میں صرف ایک عورت یعنی ایک انسان رہوں۔
میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں بھی آزادی کے ساتھ سانس
لینے کا حق رکھتی ہوں، ظلم کے خلاف فریاد کرنے کا حق
رکھتی ہوں جب کہ مرد اور قانون کی خواہش ہے کہ میری
فریادوں کی آگ کو میرے لبوں پر اور میری دھڑکن کو
مرے سینے میں خاموش کردیں۔''

فروغ کو زحمت کش مزدوروں اور خاص کر ان عورتوں سے ہمدردی ہے جو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے صبح سے شام تک محنت مزدوری میں مشغول ہیں، لیکن ان لوگوں کو جو نکمے، آوارہ اور اوباش ہیں، صبح سے شام تک صرف حسین عورتوں کے ارد گرد منڈلاتے ہیں، وہ بہت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور انہیں ''زندہ لاش'' کہتی ہیں۔ زندہ انسان کو ''جنازہ یا لاش'' کہنا ادیبوں کے نزدیک بہت بڑا طنز ہے ؎

جنازه های خوش بخت
جنازه های ملولی
جنازه های ساکت متفکر
جنازه های خوش برخورد
خوش پوش ، خوش خوراك

فروغ نے اپنی شاعری میں صرف شاہی ایران کے اقتصادی، سیاسی منظر کی تصویر کشی نہیں کی ہے بلکہ عالمی سطح پر سیاسی اور سماجی مسائل پر بھی تنقید کی ہے اور مفکروں، اصلاح کے ہم نوا دعویداروں کو ایسا پیامبر سمجھا ہے، جن کے پیغامات سراسر دنیا کی ویرانی اور انسانیت کی تباہی کے لئے ہیں۔

فروغ نے اپنی بہنوں سے گزارش کی ہے کہ ایران کی شاعرات رابعہ بنت کعب، ہستی گنجوی، عالم تاج، ژالہ قائم مقامی اور پروین اعتصامی کی طرح اپنے فکر اور اپنے حوصلے کو بلند کریں، اپنے مسائل ملک کے سیاسی وسماجی مسائل اپنی ماں بہنوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی فکر اور کارناموں کے ذریعہ لوگوں کے ذہن میں ایسے شخص کے آنے کی تصویر پیش کریں جو صحیح معنوں میں انسانیت کا نجات دہندہ ہو۔ ان کی یہ آرزو ہے کہ:

(بقیہ ص۶۹ پر)

ڈاکٹر یاسمین اختر
Tank Lane, Bhikanpur, Bhagalpur - 812001 (Mob.6299062182)

افسانچہ نگاری کا منفرد فنکار: ایم۔اے حق

افسانچہ نگاری کے فنکاروں کی بات ہو اور ایم اے حق (محمد ابرارالحق) کا نام سامنے نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ڈاکٹر ایم اے حق ہندو پاک کے چند گنے چنے افسانچہ نگاروں میں محسوب ہوتے ہیں۔انہوں نے افسانچہ نگاری کو جو خاص سمت دیا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں افسانچہ نگاری سے بے حد انسیت تھی۔اس میدان میں انہوں نے بہت سے ایسے شاگرد بنائے جو افسانچوں کی دنیا میں آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ان میں ایک نام راقمہ کا بھی ہے۔ان سے رابطہ ہونے کے بعد ہی میں افسانچہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئی۔موصوف اپنے شاگردوں کو افسانہ نگاری کے فن سے آگاہ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔

ایم اے حق نے بہت ہی کم عمری میں لکھنا شروع کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے (۱۹۶۲ء) سے ہی مضامین کے ذریعہ وہ اپنے ادبی سفر کا آغاز کر چکے تھے، پھر ۱۹۶۵ء سے وہ باقاعدہ لکھنے لگے۔اس زمانے میں ان کی کہانیاں ماہنامہ ''بچپن''، ''نونہال ٹائمز'' وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ایم اے حق نے ۱۹۶۸ سے افسانچہ لکھنے کی ابتدا کی۔ پہلے وہ طویل افسانے لکھا کرتے تھے، لیکن پھر اس سے کنارہ کش ہو کر پوری طرح افسانچہ نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ان کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ''نئی صبح'' ۲۰۰۷ میں منظر عام پر آیا تھا، پھر طویل عرصے کے بعد ۲۰۱۸ء میں ان کے افسانچوں کا دوسرا مجموعہ ''ڈنک'' شائع ہوا۔اس مجموعے کا انتساب انہوں نے اپنی بھابیوں کے نام کیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نظروں میں رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔مجموعہ ''ڈنک'' ایک سو پندرہ افسانچوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے کا پہلا افسانچہ ''خیمہ'' ہے، جسے پڑھ کر ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ پہلا افسانچہ ہی قارئین کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے:

''پپو! ٹیپ بند کر دو، اذان ہو رہی ہے۔' ممی نے کچن سے ہانک لگائی، لیکن پپو بدستور گانا سنتا رہا۔'ارے سنتے کیوں نہیں...... بہرے ہو گئے ہو کیا؟...... کہا نا کہ اذان ہو رہی ہے...... بند کرو یہ گانا وانا......' غصے میں تمتماتی ممی کمرے میں داخل ہوئیں۔'یہ تو اہل حدیث کی اذان ہے ممی......' معصوم پپو کا جواب سن کر ممی ٹھگی سی کھڑی رہ گئیں۔''

بچہ تو ناسمجھ ہوتا ہے۔اسے کیا معلوم کہ کون سی مسجد کس کے نام سے منسوب ہے۔مسلک کا مسئلہ تو ہم نے پیدا کیا ہے۔بچوں کے ذہن میں یہ سب باتیں ڈالی جائیں گی تو ان پر ایسے ہی اثرات مرتب ہوں گے۔ آج ہم شریعت کی بنیادی باتوں کو فراموش کر کے فروعی معاملات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔یہ سب دماغ کا فتور ہے۔اگر ہم اس طرح کی سوچ رکھیں گے اور آپس میں نا اتفاقی کا مظاہرہ کریں گے تو ہماری جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی، لوگ ہمیں کمزور سمجھیں گے، لہٰذا آپسی بھید بھاؤ کو مٹا کر اپنے سماج، اپنی قوم اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے آگے قدم بڑھانا چاہئے، تاکہ فضول ''خیمہ'' بندی ختم ہو۔

''افسانچہ اطفال'' کا موجد ہونے کا سہرا بھی ایم۔اے حق کے سر جاتا ہے۔کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس نوعیت کے افسانچے اپنا ایک خاص طرز رکھتے ہیں یعنی کوئی بچہ اپنے بڑے کو نہایت ادب سے اور بالکل برجستہ انداز میں کوئی ایسی ذہن کشا بات کہہ دیتا ہے جو عصری منظر و پس منظر میں اپنی اہمیت اور معنویت کا گہرا احساس دلا جاتی ہے۔ یہ بالواسطہ آموزش ادب کا وطیرہ ہے اور یقیناً ایم۔اے حق کے ''افسانچہ اطفال'' اپنے حد سے سوا موثر کلائمکس کے سبب اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔افسانچہ ''مدد'' اور ''قرض دار'' اسی نوعیت کے افسانچے ہیں۔یہ افسانچے مارچ ۲۰۱۸ء کے ''زبان وادب'' پٹنہ میں چھپے تھے اور پھر ۱۸ مئی ۲۰۲۱ء کو ڈاکٹر ایم۔اے حق کا انتقال ہوا تو اس رسالے نے اُن پر وفیاتی شذرہ کے

ساتھ بھی یہ دونوں افسانے شائع کئے تھے۔

ایم اے حق کے افسانچوں کی تاثیر اور مقبولیت کا بنیادی راز یہ ہے کہ انہوں نے انسانی معاشرت کے مختلف پہلو اور مختلف مسائل و ضروریات کو بڑی مہارت سے مختلف افسانچوں میں پیش کیا ہے۔ بطور نمونہ یہ افسانچہ دیکھئے:

''سبزیاں خریدتے وقت بڑھتی مہنگائی کا احساس نہ جانے کہاں غائب ہوجاتا ہے جب وہ رکشہ والے کو اس کی مزدوری ادا کرتا ہے۔'' (دوہری شخصیت)

اکثر و بیشتر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سوٹ بوٹ پہن کر باہر نکلتے ہیں، ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں، ویٹر کو بھاری ٹپ دیتے ہیں، سگریٹ اور شراب پر خطیر رقم خرچ کردیتے ہیں، نام و نمود کے لئے پانی کی طرح پیسے بہاتے ہیں، قیمتی چیزیں خریدتے ہیں، لیکن جب کسی غریب کو اس کی محنت کا معاوضہ دینے کی بات آتی ہے اس کا حق مارنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ دراصل یہ ''دوہری شخصیت'' ہوتی ہے جسے ایم۔اے حق نے اپنے مذکورہ افسانچہ میں آئینہ کردیا ہے۔

محض چند الفاظ میں پوری کہانی بیان کرنا اور دل کو چھو لینے والا انجام پیش کرنا کافی مشکل امر ہے، لیکن محسوس ہوتا ہے موصوف کے لئے قدرت نے یہ کام بہت آسان بنادیا تھا۔ اس طرح کے کئی متاثر کن افسانچے ''ڈنک'' میں موجود ہیں۔ جوگندر پال نے ایم۔اے حق کی افسانچہ نگاری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ایم۔اے حق اپنے قارئین کے تخلیقی مطالبات سے بخوبی واقف ہیں اور اسی لئے وہ ان کی بھرپور توجہ کے اہل بھی ہیں۔''

اور موصوف کے متعلق رتن سنگھ کا خیال ہے کہ:

''زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات جن کو عام آدمی نظر انداز کردیتا ہے، وہ ایم۔اے حق کے یہاں کہانی کے سانچے میں ڈھل کر دلکش بن جاتے ہیں۔''

وکیل احمد رضوی ان کے متعلق کہتے ہیں:

''وہ سماجی برائیوں اور معاشرتی کمزوریوں کو نئے انداز میں دیکھنے، سمجھنے پرکھنے اور پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔''

ان کے فن کا یہ کمال ہے کہ مختصر الفاظ میں پورا واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ افسانچہ ملاحظہ فرمائیں:

''پاپا! آج کل آپ ہمیں پیپر پڑھنے کی تلقین نہیں کرتے ہیں، کیوں؟' اپنی پندرہ سالہ بیٹی شکیلہ کا معصوم سا سوال سن کر امجد علی لاجواب ہوگئے۔ وہ کیا کہتے؟ ان کی آنکھوں کے سامنے اخبارات کی سرخیاں برہنہ ہوکر رقص کرنے لگیں۔'' (افسانچہ 'ماحول')

آخری جملہ اس افسانچے کی جان ہے۔ ایک کامیاب افسانچہ وہی ہوتا ہے جس کا انجام آخری جملے پر ٹکا ہو۔ مصنف نے اس افسانچے کے توسط سے آج کی معاشرت اور صحافت کی زبردست عکاسی کی ہے۔

ایم۔اے حق کے مجموعے کا ٹائٹل افسانچہ ''ڈنک'' بھی انتہائی متاثر کن ہے۔ دراصل دو کرداروں پر مشتمل یہ افسانچہ سماجی حقیقت کا بیانیہ ہے۔ اس میں ایک نوآموز قلمکار کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ نو وارد قلمکار جب کچھ لکھتا ہے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس پر کسی کہنہ مشق فنکار کی رائے حاصل ہوجائے۔ افسانچہ ''ڈنک'' کا نوآموز قلمکار بھی اپنی کہانی کی اصلاح کی غرض سے ایک نامور قلمکار کے پاس بار بار جاتا ہے، لیکن ہر بار اسے مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہوتا ہے، آپ خود ملاحظہ فرمائیں:

''کہانی لکھنا تمہارے بس کی بات نہیں......سمجھے!' پھر قدرے نرم لہجے میں گویا ہوئے: 'کیوں اپنا اور میرا قیمتی وقت برباد کرتے ہو؟'......'سر! یہ آپ کی ہی کہانی ہے جو 'بیسویں صدی' کے جنوری ۱۹۷۰ کے شمارے میں 'منزل ابھی دور ہے' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے صرف عنوان اور کرداروں کے نام ہی تبدیل کئے ہیں۔'' (افسانچہ ''ڈنک'')

یہ ہے ادب کے جغادریوں کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کے لئے حوصلہ شکن تہذیب کی جھلک اور ایک ڈھکی چھپی حقیقت پر گہرا طنز جو یقیناً ایم۔اے حق کے قلم سے احساس رکھنے والوں کے لئے گویا ''ڈنک'' کے

مصداق بن کر سامنے آتا ہے۔

ایم۔اے حق کے بعض افسانچے ایسے بھی ہیں جن میں محض ایک دو جملوں میں پوری کہانی بیان کر دی گئی ہے۔نمونے کے طور پر تین افسانچے ملاحظہ فرمائیں:

''تازہ پتی ہوئی دیوار کی دس جگہوں پر لکھا تھا: یہاں کسی قسم کا اشتہار ڈال کر اسے گندہ کرنا سخت منع ہے۔''

(افسانچہ''ہدایت'')

''یہ دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک ساٹھ سالہ برقعہ پوش ضعیفہ جینز میں ملبوس اپنی پوتی کے ساتھ سڑک پر جا رہی تھی۔'' (افسانچہ''غلط استعمال'')

''وہ کمپارٹمنٹ میں زیادہ تر ان جگہوں پر بیٹھنا پسند کرتا ہے جہاں جوان اور جاہل عورتیں اپنے ننھے بچوں کو گود میں لیے سفر کرتی ہیں۔'' (افسانچہ''نظارہ'')

اتنے کم الفاظ میں ایک بڑی کہانی کو پیش کرنا بڑی ہنرمندی کی علامت ہے اور ایم۔اے حق کے پاس یہ ہنرمندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ موصوف کے افسانچوں میں فکرواحساس کی گہرائی بہت نمایاں ہے۔ واقعات و ماجرا پر ان کا مشاہدہ عمیق ہوتا ہے۔ان کے یہاں بے شمار موضوعات ہیں۔ہر موضوع اپنے اندر حقائق کا پرتو لئے ہوتا ہے۔انھیں اپنے عصر کی معاشرت کا گہرا ادراک ہے۔بعض افسانچوں میں ان کی بے باکی بھی نظر آتی ہے۔بعض میں اشاروں، کنایوں سے کام لیا گیا ہے۔اس ضمن میں ایک افسانچے کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

''کیوں جی انور، سنا ہے تم آج کل خوب شراب پینے لگے ہو، یہ اچھی بات نہیں ہے۔قرآن میں اس کی سخت ممانعت ہے اور پھر یہ تمہارے لئے تو اور بھی مضر ہے'

......'میرے لئے ،وہ کیسے؟' ......'تمہیں دو لڑکوں کے علاوہ ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے۔''(افسانچہ''خطرہ'')

افسانچہ لکھنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔قلمکار کی تھوڑی سی لاپروائی افسانچے کو معیار سے گرا دیتی اور محض لطیفہ بنا دیتی ہے،لیکن ایم اے حق کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کسی افسانچے کو لطیفہ یا چٹکلا نہیں بننے دیا ہے:

''اب آپ کیسی ہیں اماں؟......بیس سال کی طویل مدت کے بعد بیٹے کی میٹھی بولی سن کر اس نے دھیرے سے کروٹ بدلی۔سامنے کھڑے اس کا نادم سا چہرہ دیکھ کر بوڑھی کو ایسا لگا جیسے اسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو۔

(افسانچہ''معافی'')

''انکل! یہ چاکلیٹ نہیں لوں گی۔' پانچ سالہ شبنم نے اپنے گھر آئے مہمان سے کہا۔اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔'بھلا کیوں بیٹی؟' مہمان کو سخت تعجب ہوا۔چاکلیٹ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔'انکل! ممی بتاتی ہیں کہ ماں، باپ، بھائی، بہن جیسے سگے رشتے داروں کے علاوہ دوسروں سے مٹھائی لینے سے لڑکی زخمی ہو کر اسپتال چلی جاتی ہے۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ممی یہ نہیں بتاتی ہیں۔آپ بتائیے نا انکل؟'

......'شبنم کا سوال اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ اس ننھی سی جان کو وہ کیا جواب دیتے؟ بس خاموشی ان کی مدد کو آ گئی۔''(افسانچہ''معصوم سوال'')

یہ دو افسانچے ہیں جو سماج میں ہو رہے واقعات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آج کے سماج میں جو انسانی غم ہے، درد و کرب ہے، فکر ہے، اندیشہ ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔یہ افسانچے ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ہمیں ہماری ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہیں۔یہ افسانچے ہمارے جذبات واحساسات کو جھنجھوڑتے ہیں۔ایک انسان کی حیثیت سے، ایک بیٹے کی حیثیت سے، ایک عزیز و قریب کی حیثیت سے آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ان سوالوں کے خاموش جوابات ایم۔اے حق کے افسانچوں میں کسی اَن کہے بول کی طرح گویا چیخ چیخ کر ہمیں اپنے محاسبہ کی طرف بلا رہے ہیں۔

سادہ بیانیہ، سلیس زبان ، جداگانہ طرز تحریر، دل پذیر بنت، چونکانے والا اختتام ایم اے حق کے افسانچوں کی پہچان ہے۔ان ہی خوبیوں سے مملو ہیں موصوف کے دیگر افسانچے جیسے''افواہ''،''نجات''،

(بقیہ ص ۴۲ پر)

غلام صمدانی

Room No.2, Mahanadi Hostel, J.N.U. New Delhi - 110067 (Mob.9650211794)

چوگانِ ہستی اور گئودان: صنعتی انقلاب کا عظیم بیانیہ

یہ ایک روشن تاریخی صداقت ہے کہ صنعتی انقلاب سے عالمی تاریخ میں تغیرات کے کئی موڑ آئے۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور انفرادی زندگی میں بہت ساری عمومی تبدیلیاں اسی انقلاب کے باعث رونما ہوئیں۔ موجودہ دور میں بھی اگر صنعت کاری کے سماجی اثرات پر غور کریں تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مشینی انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس نے سماج وخاندان، تہذیب وثقافت اور ادب وفن پر گہرے اثرات مرتب کیا ہے۔ بالخصوص نثری ادب میں صنف ناول کو صنعتی انقلاب کی ہی پیداوار تصور کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جس سماج کی ہیئت تشکیل پائی اور اس سے خاندان اور افراد خاندان کی زندگیوں میں جو تبدیلیاں آئیں، ان سارے مسائل کو اگر چہ اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف میں پیش کیا گیا ہے، لیکن یہ مسائل ناول میں بہرحال غالب موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سماج اور فرد کا ردعمل بیشتر ناولوں کا موضوع ہے۔ بیسویں صدی میں صنعت کاری کے اثرات سے تشکیل پانے والی سماجی، تہذیبی، خانگی اور انفرادی زندگی کو اس دور کے ناول نگاروں کی تخلیقات میں سماجیاتی اور تاریخی دونوں نظریہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ راشدالخیری، پریم چند، کشن پرشاد کول اور علی عباس حسینی اس دور کے ایسے ناول نگار ہیں جو اپنے زمانے کے تغیر پذیر حالات سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں صنعتی ارتقا کے تحت بدلتے سماج کی تاریخی ترتیب موجود ہے جو تاریخی مطالعہ کے لئے دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔

پریم چند جدید ناول نگاری کے اہم ستون تھے۔ وہ ناولانہ اسلوب اور حقیقت کے پیرایہ میں صنعت کاری اور سرمایہ داری کی ترقیاتی جہات اور سماج وخاندان پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کو بیان کر کے ملک کو سیاست، سماج، معاش اور انصاف ومساوات کی سطح پر فروغ واستحکام دینا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، سیکولر کردار، حب الوطنی، اخوت ومحبت، امن اور شانتی نیز مزدور اور کسانوں کے ہمدرد اور غمخوار بھی تھے۔ وہ ادیب کے ساتھ ساتھ مصلحانہ صلاحیت کے بھی مالک تھے اور ان کا میدان عمل بنیادی طور پر معاشرہ اور خاندان ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں رائج جابرانہ طرزحکومت، استحصالی صنعتی قوت اور فرسودہ نظام حیات کے خلاف تحریری اور عملی دونوں لحاظ سے انہوں نے آواز بلند کی اور اپنے ناولوں میں تعمیری فکرونظر سے ایک ایسے سماج اور خاندان کی تشکیل کا خاکہ کھینچا جس کی جڑیں انصاف ومساوات، اتحاد واتفاق میں پیوست تھیں۔

پریم چند نے جس طرح کسانوں، مزدوروں، غریبوں و ساہوکاروں، نچلے طبقوں، اعلیٰ ذاتوں، مذہبی ٹھیکیداروں اور بے بس عقیدت مندوں کے درمیان تصادم کو دیہی اور شہری پس منظر میں پیش کیا ہے، اسی طرح صنعتی ترقی سے پیدا ہونے والے سرمایہ دار اور مزدوروں کے بیچ پنپنے والی پیچیدگیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے صنعت سے وابستہ لوگوں کی زندگی میں بدلاؤ کے پہلوؤں کو متعدد زاویے سے دیکھا اور خانگی زندگی پر مرتب ہو رہے اثرات کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد خاندان میں تبدیلی آنے کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی وجہ معاشی حیثیت میں بہتری تھی۔ دوسری وجہ مختلف علاقوں اور طبقوں کی آمیزش تھی اور تیسری وجہ پشتینی مقامات سے ہجرت۔ ان وجوہات کی بنیاد پر خاندان میں دو طریقے سے بدلاؤ آرہے تھے۔ ایک یہ کہ وہ خاندان جو کارخانوں میں کام کر رہے تھے، ان کے طرز رہائش اور طرز زندگی کے معیار میں بہتری آرہی تھی۔ دوسرا یہ کہ وہ

خاندان جس کے ہنرمند اور تعلیم یافتہ افراد گھروں کو خیرآباد کہہ چکے تھے ان میں تنزلی بڑھتی جارہی تھی۔ مزید یہ کہ دونوں کے درمیان آئے دن فاصلے بڑھنے کی وجہ سے خاندان میں بکھراؤ پیدا ہورہا تھا جس کے نتیجے میں چھوٹے خاندان کی بنیادیں مضبوط ہورہی تھیں۔

صنعت کاری کے سبب ایک طبقہ سرمایہ داروں کا بھی وجود میں آیا تھا۔ وہ جو بڑی بڑی فیکٹری کے مالک تھے، ایسا نہیں کہ اس سے پہلے بھی ان کی سماجی اور خانگی زندگی ایسی ہی تھی جیسا کہ سرمایہ دار ہونے کے بعد وہ معیار بند ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے سے جن کی حیثیت سرمایہ دارانہ نہیں تھی خواہ وہ زمیندار یا کسی بڑی مالیات کے مالک ہوں، ان میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں، ان کے سماجی اور خاندانی اقدار بدلے۔ رشتے ناطے کی ہیئت وصورت میں تغیرات پیدا ہوئے اور سب سے اہم یہ کہ دولت کی فراوانی کے سبب ان کے انسانی نظریات میں بدلاؤ آتا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی سماجی اور خانگی زندگی پر صنعتکاری کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے ''تلاش ہند'' میں لکھا ہے:

> ''ہندوستان میں مشترکہ خاندانی نظام دن بہ دن ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس کا اثر صرف اقتصادی حالات میں تبدیلی تک محدود نہیں بلکہ زندگی میں بہت سی پیچیدگیاں اور عملی دشواریاں بھی پیدا ہورہی ہیں۔ ہندوستانی زندگی میں یہ انحطاطی رجحان ہر جگہ سرایت کرگیا ہے۔'' (بحوالہ فخر الکریم صدیقی، اردو ناولوں میں خاندانی زندگی، ص ۱۵۰)

یہی وہ سارے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر ایک ایسا سماج تشکیل پارہا تھا جس میں استحصال، ظلم، حق تلفی اور بے مروتی عام ہوتی جارہی تھی اور نہ جانے کتنے ہی انسانی اقدار سے محرومی کی کیفیت بڑھتی جارہی تھی۔ پریم چند کے ناولوں کا منظر وپس منظر، اسی سماج وخاندان کی تفہیم ہے اور اس میں نوآبادیاتی جبریت اور اس سے پیدا ہونے والا انتشار، ہندوستانی صنعتی مسائل، زرعی کیفیت، محنت کشوں کی صورت حال، اجرت میں کمی اور فرائض کی ادائیگی میں سختی، سرمایہ داروں کی زیادتی، خاندان اور افراد کے درمیان پھیلنے والی غلط فہمی اور بڑے بڑے کارخانوں کے نقصانات وغیرہ وہ سبھی کچھ شامل ہے جس سے بیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''ٹالسٹائی نے اپنے ناول 'انا کرنینا' کا آغاز اس طرح کیا ہے۔ 'تمام آسودہ اور خوش اطوار گھرانے ایک سے ہوتے ہیں، لیکن ناآسودہ گھرانوں کی ابتری اپنی علاحدہ نوعیت رکھتی ہے۔' ٹالسٹائی نے اپنے اس ناول میں کچھ ایسے ہی گھرانوں کی الجھنوں، تلخیوں اور اخلاقی پستیوں کو موضوع بنایا ہے۔ پریم چند کے ناول بھی ہندوستان کی معاشرت بالخصوص گھریلو زندگی کے بعض مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ٹالسٹائی کے گھرانے روسی معاشرہ کے اعلیٰ طبقہ کی اور پریم چند کے گھرانے ہندوستان کے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔''
>
> (قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص ۲۱۶)

اس قدرے طویل تمہید کے ساتھ یہاں ہمارا خاص مقصد بایں جہات پریم چند کے دو ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ ان میں ایک ''چوگان ہستی'' اور دوسرا ناول ''گئودان'' ہے۔ اس میں دورائے نہیں کہ ''چوگان ہستی'' ایک ایسا ناول ہے جس میں اس دور کی زندگی کی تمام باریکیوں اور گہرائیوں کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ سماج کے خاتمے، صنعتی ترقی کے سبب سرمایہ دارانہ اور مزدور سماج کے بننے بگڑنے کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ پریم چند نے اپنی ژرف نگاہی سے ہندوستان کی اس بدلتی ہوئی سماجی اور خانگی زندگی کے درمیان پیدا ہونے والے تضاد اور تصادم کو فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے۔ صنعتی انقلاب کی خرابیوں اور اچھائیوں پر بھرپور گرفت اور مادی غلبے سے آگاہی کی وجہ سے انہیں اس چیز کا بھی علم تھا کہ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے تسلط اور مزدوروں کے استحصال روایتی زندگی کے بہت سارے مفید اقدار کو پامال کردیں گے۔

پریم چند نے ''چوگان ہستی'' کو ۱۹۲۴ء میں مکمل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں صنعتی اور کاروباری صورت حال بہتر ہوئی تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی یہ پرسکون زمانہ تھا۔ ادیب اور دانشور سنجیدگی سے سماجی اور ملکی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

انہوں نے صنعت اور سیاست پر غور وفکر کرنے کے بعد معاصر زندگی کی سماجی اور انفرادی ہیئت سے آگاہی حاصل کی اور اسے اپنے ناول کا موضوع بنایا۔

''چوگان ہستی'' کا مرکزی کردار سورداس ہے جو نیک نامی کے لئے مشہور ہے۔ ورثہ میں ملی اپنی زمین کو چراگاہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کسی طرح بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا کردار صنعت کار جان سیوک کا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے کردار ہیں جو مختلف طبقے اور متعدد خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ناول کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل پانڈے پور نامی ایک ایسی بستی کی کہانی ہے جس میں کئی خاندان بستے ہیں۔ پریم چند نے سورداس اور جان سیوک کی کہانی کے ضمن میں سرمایہ داروں اور کسانوں کے تصادم، گھریلو تنازعات، ازدواجی اور انفرادی رشتوں کی جزئیات کو بھی بیان کیا ہے۔ جان سیوک سورداس سے کسی بھی قیمت پر زمین حاصل کرنے کے لئے ظلم و جبر کے سارے ہتھکنڈے اپناتا ہے اور عدالتوں اور اعلیٰ عہدہ داروں سے ساز باز کر کے اپنی خود غرضانہ چال میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ سگریٹ کا کارخانہ کھولنے کے لئے صرف سورداس کی زمین ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں والوں کے پشتینی مکانات بھی خالی کرائے جاتے ہیں تاکہ وہاں مزدوروں کی رہائش کا انتظام کیا جاسکے۔ سورداس کسی بھی قیمت پر گھر اور زمین چھوڑنے کے لئے راضی نہیں ہوتا۔ بالآخر پولس کی جھڑپ میں اسے گولی ماردی جاتی ہے، پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتا اور کہتا ہے:

> ''کوئی کسی کی نہیں مانتا۔تم کھیلنے میں ہوسیار (ہوشیار) ہو اور ہم اناڑی ہیں بس اتنا پھرک (فرق) ہے......ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں، روئے تو نہیں، دھاندلی تو نہیں کی، پھر کھیلیں گے، جرا دم تو لے لینے دو۔ ہار ہار کر تمہیں سے کھیلنا سیکھیں گے اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی۔'' (چوگان ہستی، دوم، ص ۳۹۱)

سورداس اور جان سیوک کی لڑائی کا دائرہ محض انہی فریقین تک محدود نہیں اور نہ ہی اس میں پانڈے پور میں فیکٹری اور انڈسٹری کھلنے کے بعد وہاں کے جغرافیاتی حالات اور وہاں رہنے والوں کے سماجی احوال بیان ہوئے ہیں، بلکہ پریم چند نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر صنعت کاری کے نتیجے میں سرمایہ دار اور غریب کسان کے درمیان ہونے والے تصادم کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ انہوں نے سماجی اور خانگی نظام حیات اور بدلتے اقدار کے طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ سورداس مظلومی اور محرومی کے باوجود موت کے وقت تک سماج اور خاندان کی بنیادی قدروں اور انسانی فلسفے کو ترک نہیں کرتا ہے اور ہارنے کے بعد بھی انسانی اصولوں اور اس کے رشتوں کی بنیاد پر جیت کی آس لگائے رہتا ہے۔

پریم چند نے ان مسائل کو سورداس اور جان سیوک کی کہانی میں پیش کر کے ہندوستان میں صنعتکاری کے ان عوامل کو اجاگر کیا ہے جن سے سماج، خاندان اور فرد پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ جان سیوک کو دولت وثروت کے باوجود اطمینان نصیب نہیں۔ بالخصوص گھریلو اور ازدواجی زندگی میں اسے کئی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ کبھی بیٹی کی جدید طرز فکر سے بیزار رہتا ہے تو کبھی اس کی آزاد خیالی اور زندگی کے معاملے میں خودمختاری سے۔ اس کہانی میں ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں ان سرمایہ داروں کی نفسیات کا بھی ذکر ہے جن کے لئے دولت انسان اور انسانیت سے بڑی حقیقت بن گئی ہے۔ جان سیوک کا مسئلہ صرف یہ نہیں کہ سگریٹ کی فیکٹری کیسے کھولا جائے بلکہ اب اس کی سرمایہ دارانہ حیثیت کا بھی سوال ہے۔ اسے صنعتکاری اور استحصالی قوت کی بنیادوں پر مبنی اعلیٰ حکام سے وابستگی کا غرور ہے، اس کے لئے انسانی، سماجی اور رشتوں کی پامالی ایک چھوٹی چیز ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسانی اور سماجی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات کی تفہیم اور تقابل کے پہلو بھی اس ناول میں موجود ہیں۔

پریم چند اپنے منشا کی تکمیل کے لئے کرداروں میں کایا پلٹ کے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ جان سیوک کا سرمایہ دارانہ کردار سماج اور انسانی اقدار سے کوسوں دور تھا، لیکن انہوں نے اپنی نظریاتی تکنیک سے اس میں ساری کھوئی ہوئی قدروں کو اجاگر کر دیا ہے:

> ''سیوک......سورداس، اگر اس فلسفہ کو، زندگی کے اس بھید کو میں بھی تمہاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے میرے کارخانہ کو آگ سے بچا لیا تھا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل

ڈالتا۔تم اس لڑائی میں ہوشیار ہوسورداس۔میں تمہارے سامنے نادان بچہ ہوں۔دنیا کی نظروں میں میں جیتا اور تم ہارے،مگر میں جیت کر بھی دکھی ہوں اور تم ہار کر بھی سکھی۔تمہارے نام کی پوجا ہو رہی ہے اور میرا پتلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔میں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمہارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔سرکار کی آڑ سے لڑا۔مجھے جب موقع ملا میں نے تمہارے اوپر ناجائز حملے کئے۔اس کا مجھے افسوس......''(چوگان ہستی،دوم،ص۳۸۰)

پریم چند نے جس زمانے میں یہ ناول لکھا تھا،ممکن ہے اس دور کے سماج اور فرد کے اندر ظاہری پیچیدگیوں کے باوجود باطنی اور داخلی شفافیت موجود ہو۔اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جان سیوک کے اندر کا یا پلٹ ہونے کا سبب انسانی رویہ کے عین مطابق ہو،کیونکہ انسان کبھی کبھی حالات اور ذاتی مفاد کے دباؤ میں غیر انسانی عمل پر ضرور آمادہ ہو جاتا ہے، لیکن جب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور زندگی کی حقیقت آشکار ہوتی ہے تو مثبت قدروں کی جانب اس کا میلان خود بخود ہو جاتا ہے،لہٰذا اسے بھی پریم چند کے یہاں ان کے خاص نظریاتی غلبہ یا ان کی مثالیت پسندی سے قطع نظر ان کی حقیقت نگاری پر محمول کیا جاسکتا ہے۔البتہ موجودہ زمانے کی سرمایہ دارانہ روایت میں اس نوعیت کی تبدیلیوں کے امکانات گویا نہیں کے برابر ہیں۔

پریم چند کو عصری حالات سے آگہی اور مستقبل کے امکانات کی دور اندیشی میں کمال حاصل تھا۔جنگ عظیم اول کے دوران فوج کے لئے چمڑے کی مصنوعات کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا، جس کے نتیجے میں ہندوستان میں بھی چمڑے کی صنعت میں بہتری آئی تھی۔خاص طور سے کلکتہ اور مدراس میں اس کے کئی یونٹس قائم ہوئے۔ پریم چند نے اس صنعت سے وابستہ مزدوروں کی سماجی اور خانگی صورت حال کو طاہر علی، ماہر علی اور ان کی تین سوتیلی ماؤں کے ذریعہ پیش کیا ہے۔اس سے مسلم متوسط طبقے اور اس خاندان کی بھی جو سرکاری ملازمت کے دوران خوشحال تھا،لیکن اب مالی مشکلات نے اس میں بدحالی پیدا کر دی ہے،بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

طاہر علی چمڑے کے کارخانے میں تیس روپیہ مہینہ پر کام کرتا ہے۔زمانے کی تبدیلیوں کے تحت بال بچوں کی پرورش کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی ماہر علی کی تعلیم کے لئے وہ اپنی بیوی کے زیورات تک فروخت کر دیتا ہے،لیکن خانگی ضروریات اور تعلیمی اخراجات کی بھرپائی نہ کر پانے کی صورت میں اس کے ایمان متزلزل ہو جاتے ہیں اور وہ چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔چوری کے جرم میں اسے جیل ہو جاتی ہے۔یہاں سے خاندان میں غلط فہمیوں کی شروعات ہوتی ہے۔ماہر علی اس کے تئیں بدگمان ہو جاتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ بھائی نے اپنی بری عادتوں کی بدولت خاندان کی عزت داؤں پر لگا دیا۔اسے یہ بھی غلط فہمی ہوتی ہے کہ بھائی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لئے چوری میں ملوث ہو رہا ہے۔اس طرح خاندان کے دوسرے افراد بھی اس سے بدگمان ہو گئے اور خاندان اقتصادی بحران کی وجہ سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں ٹوٹنے بکھرنے لگا۔اس میں ایک طرف مشترکہ خاندان میں باہمی تعاون کے جذبہ کی نشاندہی ہوتی ہے اور دوسری طرف اس میں پیدا ہونے والے منفی اثرات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ایک بڑے مشترکہ خاندان میں جب کسی کے تئیں بدگمانی ہو جاتی ہے یا کوئی بڑی آفت میں پڑ جاتا ہے تو معاشی بدحالی میں بھی گھر والے اس کا ساتھ کس طرح چھوڑ دیتے ہیں اس کا اندازہ طاہر علی کی بیوی کی حالت اور خاندان کے منفی رویے سے کیا جاسکتا ہے:

''رات کے نو بج گئے۔کلثوم (بیوی) دیکھ رہی تھی کہ چولہا گرم ہے۔مصالحہ جات کی خوشبو آ رہی تھی۔ بگھارنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی،لیکن جب بڑی دیر تک کوئی اس کے بچوں کو بلانے نہ آیا تو ڈاڑھیں مار کر رونے لگی۔اسے معلوم ہو گیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔دنیا میں کوئی میرا نہیں ہے۔دونوں بچے روتے روتے سو گئے تھے۔انہیں کے پائینتی وہ بھی پڑی رہی۔یا اللہ! یہ دو دو بچے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔گھر کے آدمیوں کا یہ حال۔یہ ناؤ کیسے پار لگے گی......رقیہ (سوتیلی ماں) سالن اور روٹی

کس جیتے کھائیں گی۔انہیں تو زردہ اور شیر مال چاہئے۔
دوسرے روز دونوں بچے سویرے ہی باورچی خانہ میں گئے تو زینب نے ایسی کڑی نگاہوں سے دیکھا کہ بس روتے ہی لوٹ آئے۔اب کلثوم سے ضبط نہ ہوسکا۔وہ جھلا کر اُٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر ماما سے بولی۔ تو نے بچوں کو کھانا کیوں نہیں دیا؟ کیا اتنی جلد کایا پلٹ گئی؟ اس گھر کے پیچھے ہم مٹی میں مل گئے اور آج میرے بچے بھوکوں کے مارے تڑپیں کسی کو ترس نہ آئے۔''(چوگان ہستی دوم،ص۲۳۰وص۲۳۱)

پریم چند نے ''چوگان ہستی'' میں اور بھی بہت سارے خاندانوں کا ذکر معاشی اور سماجی زاویہ نظر سے کیا ہے۔دراصل بیسویں صدی کا یہ زمانہ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ہر اس شخص کے لئے پریشان کن تھا جو نچلے یا متوسط درجہ سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے کئی وجوہات تھے۔ایک یہ کہ برطانوی حکومت کی اقتصادی پالیسی ہی ایسی تھی جس میں صرف اور صرف انگریزوں اور انگریز سرکار کا فائدہ مقصود تھا۔ہندوستانی عوام اور ملکی انتظام کے تئیں وہ بالکل سنجیدہ نہیں تھے۔دوسری بات یہ تھی کہ کچھ ہندوستانی افراد بھی محض مالی منفعت کے تابع ہوکر طرح طرح سے انگریزوں کی دلالی کررہے تھے۔

بیسویں صدی میں صنعتی ترقی اور ہندوستانی سماج کے بدلتے اقدار کی عکاسی پریم چند نے اپنے ناول ''گئودان'' میں بھی کیا ہے۔اس کا بیشتر حصہ ہوری کے سماجی، خانگی، مذہبی اور اقتصادی المیہ کی داستان پر مبنی ہے اور اس ضمن میں دیہی معاشرہ، ایک گاؤں کی مکمل اور متحرک شکل میں موجود ہے۔اسی کے مقابل شہری حیات آفرینی زمیندار رائے صاحب، صنعت کار کھنا، صحافی اونکار ناتھ، دلال تنخا صاحب، ڈاکٹر مالتی، پروفیسر مہتا اور سیاسی بصیرت رکھنے والے مرزا خورشید جیسے کرداروں کے حقیقی ونفسیاتی واقعات کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔گوبر کی داستان انہی دونوں سماج کے تضاد اور تصادم کی پروردہ ہے۔گوبر دراصل صنعتی مزدور کی شعوری بیداری اور احتجاجی رویے کی علامت ہے جو اس دور میں پروان چڑھ رہی تھی، نیز پریم چند نے گوبر کے ذریعہ مشترکہ خاندان اور روایتی اقدار میں در آنے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جدید صنعت سے وابستہ مزدور کے مرکزی خاندان کے تشکیلی عمل کو بھی بیان کیا ہے۔جدید صنعتی ارتقا کے نتیجے میں شہری آبادکاری اور دیہی وقصباتی علاقوں سے لاکھوں انسان کی شہروں کی جانب منتقلی سے انسانی اور خانگی زندگی میں جو پریشانیاں لاحق ہورہی تھیں اس کا اندازہ گوبر کے ان تجربات سے لگایا جاسکتا ہے جنہیں وہ پہلی مرتبہ لکھنؤ جا کر محسوس کرتا ہے اور پھر گھر میں آنے کے بعد سماج اور خاندان سے اس کی بغاوت ہوتی ہے۔اس کی ماں دھنیا بیٹے سے کیسی کیسی امیدیں باندھ رکھی ہوتی ہے، لیکن اس کے سبھی ارمانوں کا اس وقت جنازہ نکل جاتا ہے جب گوبر نہ صرف گھر چھوڑتا ہے بلکہ معمولی جھگڑے کی وجہ سے دھنیا کی ماتا کو بھی ٹھکرا دیتا ہے:

''ہوری نے بھرے گلے سے کہا۔بیٹا کچھ کہنے کا منھ تو نہیں ہے، پر جی نہیں مانتا۔کیا جراجا کر اپنی ابھاگنی ماتا کے پاؤں چھولو گے تو کچھ برا ہوگا؟ گوبر نے منھ پھیر کر کہا 'میں اسے اپنی ماں نہیں سمجھتا۔' اور دھنیا بیٹھی رورہی تھی، جیسے کوئی اس کے دل کو آرے سے چیر رہا ہو۔اس کی ماتا اس گھر کے مانند ہورہی تھی جس میں آگ لگ گئی ہو اور سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا ہو، بیٹھ کر رونے کے لئے بھی جگہ نہ بچی ہو۔''(گئودان،ص۲۸۹وص۲۹۰)

معاشی تنگ دستی کی وجہ سے رشتوں میں افتراق کا سبب محض گوبر کا احتجاج نہیں ہے بلکہ یہ ہر دور کی نئی نسل اور پرانی پیڑھی کے درمیان آزادانہ تصورات اور روایتی طرز فکر کا تصادم ہے جس کو پریم چند نے حقیقت نگاری کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور خانگی زندگی کی بدلتی تصویر کو مزید واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے بعد گوبر جب واپس شہر آ کر باضابطہ مرکزی خاندان کے تحت زندگی کی تگ و دو میں قدم رکھتا ہے تو شہروں کی بھیڑ میں رہائش کے طریق کار کی نوعیت اور روح فرسا کیفیت کو پریم چند ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''وہ گھر بھی اب اسے بنجر سا لگتا تھا۔جھنیا اب اس میں تنہا بیٹھی رہتی تھی۔لڑکا دن بھر آنگن میں یا دروازے

کا عادی تھا۔ وہاں اس کے کھیلنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔
کہاں جائے؟ دروازے پرمشکل سے گز بھر کا راستہ تھا۔
یہاں عفونت پھیل رہی تھی...... گھر پر کبھی دھنیا، کبھی روپا،
کبھی پنیا۔ یہاں تنہا جھنیا تھی اور اسے گھر کا سارا کام
بھی کرنا پڑتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں جھنیا اس زندگی
سے اکتا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ کہیں تخلیہ میں جا کر بیٹھے اور
خوب بےفکری سے لیٹے، سوئے، مگر وہ تخلیہ کہیں نہ ملتا
تھا۔ اب اسے گوبر پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے شہری زندگی کی
کتنی دلکش تصویر کھینچی تھی اور یہاں اس کال کوٹھری کے
سوا کچھ نہ تھا۔'' (گئودان، ص۳۴۹و ص۳۵۰)

اس کے علاوہ اور بھی دیگر ایسی پریشانیاں ہیں جسے مرکزی خاندان کو جھیلنی پڑتی ہے۔ جھنیا دردزہ کے باوجود گھر کے کام کرنے پر مجبور رہتی ہے۔ دوران حمل اسے وہ سارے کام کرنے پڑتے ہیں جسے مشترکہ خاندان میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا جاتا ہے۔ اسی عرصہ میں اس کا بیٹا للو بھی مرجاتا ہے۔ اس سے گوبر کی نفسیات اور داخلی کیفیت تو اتنی متاثر نہیں ہوتی تاہم جھنیا کے لئے یہ ایک بڑا حادثہ تھا۔ اس کی زندگی میں اس حادثہ کے انمٹ نقوش گہرے ہوگئے تھے۔ یہاں تک تو کچھ راحت تھی کہ گوبر اپنا خوانچہ لگاتا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا تھا، چاہے اس میں کامیاب نہ ہو پر جب وہ کھنا کے مل میں نوکری کرنے لگتا ہے تب اس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب وہ غم غلط کرنے کے لئے شراب کا بھی عادی ہورہا تھا۔ یہ صنعتی ارتقا کی دین ہے کہ مزدوروں میں آزادخیالی اور عیش پرستی کی زندگی جینے والی ذہنیت تشکیل پارہی تھی۔ مخرب اخلاق اور آزادانہ روش کے سبب خانگی نظام حیات اور رشتوں میں تلخی، فساد اور جھگڑے جیسی کمزوری اور اخلاقی اقدار سے انحراف کی روایت جنم لے رہی تھی۔ شہری اور صنعتی زندگی کی ہیجان انگیزی اور دیہی معاشرے کی طمانیت کا موازنہ پریم چند نے بڑے خوبصورت انداز میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''گوبر نے خوانچے سے نراس ہوکر شکرمل میں نوکری
کرلی تھی۔ مسٹر کھنا نے پہلے مل سے حوصلہ پا کر حال ہی
میں یہ دوسرا مل کھول دیا تھا۔ گوبر کو وہاں بڑے سویرے
جانا پڑتا اور دن بھر کے بعد وہ جب چراغ جلتے گھر واپس
آتا تو اس کے بدن میں ذرا بھی جان نہ رہ جاتی۔ پہلے
گھر پر اسے کچھ کم محنت نہیں کرنی پڑتی تھی، مگر اسے وہاں
ذرا بھی تکان نہ ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہنس بول بھی لیا
کرتا تھا۔ وہاں اس کا جسم چاہے جتنا کام کرے، دل
آزاد رہتا تھا۔ اب یہاں اتنی جسمانی محنت نہ ہونے پر
بھی جیسے اس طوفانی شور اور ہلچل کا اس پر بوجھ سالدا رہتا
تھا۔ یہ اندیشہ بھی لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب ڈانٹ پڑ
جائے۔ سبھی مزدوروں کی یہ حالت تھی، سبھی تاڑی یا
شراب میں اپنے جسمانی اور دماغی تکان کو ڈبو دیا کرتے
تھے۔ گوبر کو بھی شراب کا چسکا لگا۔ گھر آتا تو نشے میں چور
اور پہر رات گئے اور آکر کوئی نہ کوئی بہانہ کھوج کر جھنیا کو
گالیاں دیتا۔ گھر سے نکالنے لگتا اور کبھی کبھی مار بھی دیتا۔
جھنیا کو اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ داشتہ ہے،
اسی لئے اس کی یہ ذلت ہورہی ہے۔'' (گئودان، ص۳۵۲)

یہ اقتباس مشینی دور کی زندگی کی مرقع کشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ پریم چند نے صنعتی مزدوروں کی صورت حال کا عالمی پس منظر بیان کرتے ہوئے انسان کے جسمانی ونفسیاتی کرب کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ انسان جو کل تک ہنس بول رہا تھا، جس کی ظاہری اور باطنی کیفیت خوشگوار تھی، جو اخلاقی قدروں سے آراستہ تھا، جس کے گھر میں طمانیت تھی اور جس کے ازدواجی و خاندانی رشتے محبتوں کے امین تھے، آج کیسا بےبس ہے اور صنعتی ارتقا نے اس کی صبح وشام سے یہ سارے اوصاف کس طرح زائل کردئے ہیں۔

برٹش حکومت کے مفاد پرستانہ رویے سے اسی زمانے میں ملوں کے ٹیکس میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ مل مالکوں کو یہ بہانہ مل جاتا ہے کہ وہ اس اضافہ کی آڑ میں مزدوروں کی اجرت کم کردیں کیونکہ پانچ کے نقصان سے دس کا منافع تھا۔ دوسری طرف مزدوروں میں احتجاج اور ہڑتال کے شعور کو بلند کرنے کے لئے مرزا خورشید اور اونکارناتھ بھی

میدان میں آ چکے تھے۔ کھنا جوٹل کا مالک تھا اسے مزدوروں سے ہمدردی تو تھی، لیکن صنعتی اور سرمایہ داری کے اصول کا اس پر اتنا غلبہ تھا کہ وہ بھی کشمکش سے نکل نہیں پا رہا تھا، البتہ کھنا کی بیوی گوبندی مزدوروں کی حمایت میں تھی، چنانچہ وہ سرمایہ داروں کی عیش کوشی کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ کھنا کی خانگی زندگی سے عدم توجہ کا سبب صنعتی ذہنیت کو قرار دیتی ہے۔ اسے شوہر پرستی پر پورا یقین ہے، لیکن اس کی نفسیاتی اور داخلی قوت کھنا کے مزاج سے بالکل مختلف تھی۔ سب سے زیادہ وہ دھن دولت کی فکر میں کھنا کی عدم فرصتی، بچوں سے بے تعلقی اور اپنی بے عزتی سے خائف رہتی ہے۔ غرض یہ کہ پریم چند نے صنعتی ارتقا کے نتیجے میں خانگی زندگی کے انتشار اور سماجی ہیئت وصورت کی تخریب کاری کو اس ناول میں پیش کیا ہے۔ قمر رئیس نے پریم چند کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''فکر وشعور کے اعتبار سے اردو کا کوئی ناول نگار پریم چند کی بلندی اور بصیرت کو نہ پہنچ سکا۔ ان کے ناول صحیح معنی میں اس عہد کا رزمیہ ہیں۔ ان میں سیکڑوں کردار سامنتی اور صنعتی دور کے مکمل اور متحرک انسان کا نقش ابھارتے ہیں اور اپنی اور اپنے عہد کی زندگی کے نجانے کتنے تاریک گوشوں، عقدوں اور الجھنوں پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ آج بھی ہم اس آئینہ میں اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ آج بھی وہ تمام مسائل حل نہیں ہو سکے۔ آج کے سماج میں بھی فرد اسی طرح مجبور و بے بس ہے۔ ان ہی آزمائشوں کا شکار اور ان ہی کشمکشوں کا اسیر......''

خلاصہ یہ کہ جدید صنعتی پیداواری نظام نے انسانی طرز حیات کو اس قدر متاثر کیا کہ سماج اور خاندان میں تبدیلیوں کا آنا ناگزیر ہو گیا۔ اس نے نوجوانوں اور عورتوں کی گھریلو ذمہ داریوں کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کیا اور گھر اور خاندان سے باہر جانے کے مواقع فراہم کر دیے۔ بڑے پیمانے پر پیداوار کے نظام کی وجہ سے نہ صرف خاندانی ربط ٹوٹے بلکہ پیشہ ورانہ ہیئت وساخت میں بھی تبدیلی آئی۔ روایتی ہنرمندی، خاندانی فنکاری، گھریلو دستکاری اور گھریلو صنعتکاری جو مشترکہ خاندان سے مربوط تھی سبھی میں تنزلی آئی۔ انسانی سماج وخاندان پر ہونے والے صنعتی ارتقا کے اثرات کو پریم چند نے اپنے ناول ''چوگان ہستی'' اور ''گئودان'' میں جس طرح پیش کیا ہے اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور اس حوالے سے ان دونوں ناولوں کو بلا تکلف صنعتی انقلاب کا عظیم بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔ ❁❁

افسانچہ نگاری کا منفرد فنکار...... (ص ۳۵ سے آگے)

''شرمندگی''، ''ہار جیت''، ''حقیقت''، ''میری جیت''، ''نتیجہ'' وغیرہ۔ یہ افسانچے صرف ہمیں فکرمند نہیں کرتے ہیں، بلکہ ہمارے ذہنوں کو مثبت رُخ سے تحریک بھی دیتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے متعلق پرویز بلگرامی کا خیال ہے کہ:

> ''ایم اے حق کے زیادہ تر افسانچے دل پر محسوس ہوتے ہیں اور بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ زبان وبیان کی تکنیک کے لحاظ سے یہ افسانچے نہایت خوبصورت و مؤثر ہیں اور مصنف کے گہرے سماجی شعور کی آئینہ داری کرتے ہیں۔''

ادبی تحریروں کے اثر ونفوذ کا تعلق صرف موضوع کے انتخاب یا یوں کہا جائے کہ بہت ہی ژرف نگاہی کے ساتھ وقت کے سلگتے ہوئے موضوعات کی پہچان اور ان کی پیش کش سے نہیں، بلکہ اس معاملے کا تعلق جزئیات رسی اور جزئیات شناسی کے ساتھ ساتھ ایسے طرز ادا سے بھی ہے جو دل سے نکل کر دل پر اثر کرنے کی ادا کہلاتا ہے اور موضوع شناسی کے ساتھ ساتھ اس ادا سے کام لینے کا بے پناہ ہنر اور شعور بھی قدرت نے ایم اے حق کو بخش دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کل بھی اپنی مقبولیت کا پرچم لہرا رہے تھے اور آج بھی اپنی فکری وفنی ندرت کا گہرا احساس دلانے میں بہرصورت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ❁❁

☆ مالداروں سے نزدیکی کم رکھو، اُن کے پاس کم کم جایا کرو تاکہ اللہ پاک کی نعمتیں تمہاری نگاہ میں ذلیل وخوار نہ ہوں

☆ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو کہ اس میں شفا اور کامیابی ہے اور لوگوں کے عیب نہ بیان کرو کہ اس میں بیماری اور ناکامی ہے

☆ جس شخص کو ایسے دوست کی تلاش ہو جس میں کوئی خامی نہ ہو تو اُسے یقیناً کبھی کوئی دوست نہیں ملے گا

الطاف احمد

Research Scholar Deptt. or Urdu, University of Kashmir Hazratbal
Srinagar - 190006 (J&K) (Mob. 9906560217)

مابعد جدیدیت: ایک بیانیہ

ناصرعباس نیر کے اس قول سے میں اپنے مقالے کی ابتدا کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ:

''مابعد جدیدیت کی تعریف، دائرہ کار، مقاصد اور مضمرات پر عمومی اتفاق رائے موجود نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔عمومی اتفاق رائے خود مابعد جدیدیت کی روح کے خلاف ہے۔''

جب بھی کوئی نیا نظریہ اردو میں متعارف ہوتا ہے تو نہ جانے کیوں اس کو قبول کرنے کے بجائے ہم اس کو رد کرنے پر قانع نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ناصرعباس نیر لکھتے ہیں:

''جو لوگ جدیدیت کا فہم کامل نہیں رکھتے، انہیں مابعد جدیدیت کی ثقافتی لرزشوں اور فکری انقلابات کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے میں دقت بہر حال ہوگی اور شاید کچھ پریشانی بھی۔''

چارلس جینکس نے ۱۹۷۷ میں اپنی کتاب "The Language of Post Modern Architecture" میں مابعد جدیدیت پر تفصیل کے ساتھ لکھا اور یہیں سے مابعد جدیدیت کی اصطلاح عام ہونی شروع ہوئی۔

مابعد جدیدیت کے حوالے سے مستند بات یہ ہے کہ اس میں کسی بھی نظریہ کو برحق مانا گیا ہے۔یہاں قاری کو اپنے زاویۂ نظر یا تنقیدی شعور یا کسی مخصوص فکر کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ ترقی پسند جدید مباحث کو مغرب کے سیاسی ایجنڈے کے بطور پیش کرتے ہیں اور ان کے مقابل جدیدیت کے بیشتر علمبردار انہیں نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ انہیں ترقی دینے میں بھی پیش پیش ہیں۔ بقول ناصرعباس نیر:

''جدیدیت ایک جامع مگر مبہم اصطلاح ہے۔''

بحیثیت رجحان کے مابعد جدیدیت کو بیسویں صدی میں فروغ ملا۔یہ ایک عالمی تحریک تھی جسے بیسویں صدی میں خوب پھولنے پھلنے کے مواقع میسر آئے۔برصغیر میں اسے ساٹھ کی دہائی سے جوڑ کر دیکھا جا رہا ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے اگر بالغ النظری اور وسعت قلبی سے دیکھیں تو اس کے اثرات صدیوں پرانی تخلیقات یا فن پاروں پر ثبت نظر آئیں گے۔ مغرب میں تمام تخلیقی فنون اسی کے زیر اثر رہے ہیں۔وہاں کے کلچر، ثقافت، فنون لطیفہ یا دیگر فن پاروں اور تخلیقات پر اس کے واضح اثرات مرتب نظر آتے ہیں۔وزیر آغا کا خیال اس حوالے سے کچھ یہ ہے:

''جدیدیت وکٹورین تصورات و روایات اور cogito جس کا مرکزی نقطہ 'میں' ہے، کے تصور کے ردعمل میں منظر عام پر آئی۔انسان دوستی، عقلیت اور خودمختاریت جدیدیت کے اہم ترین عناصر تھے۔''

مابعد جدیدیت کے حوالے سے وزیر آغا کے مباحث قابل غور ہیں اور زیر بحث اس لئے ہیں کیوں کہ بقول ناصرعباس نیر:

''پاکستان میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے صحیح معنوں میں علمی سنجیدہ اور نتیجہ خیز بحث وزیر آغا نے کی ہے۔''

ساٹھ کی دہائی اور بیسویں صدی کی مغربی فکر کو کچھ ادیب اس کا آغاز قرار دیتے ہیں۔دراصل اس دہائی میں جہاں بیشمار مغربی افکار کا احاطہ ہوا، وہیں ادبی افکار کو بھی سائنسی نقطہ نظر سے مرتب کیا جانے لگا۔

یہی وہ دور تھا جب ساختیات نے شعریات پر توجہ کی جسے بحر معانی اور متعدد صورتوں کو پیدا کرنے والا Structure بھی کہا گیا ہے اور اسی زمانہ کو وزیر آغا نے اپنے فکری خدوخال کے لحاظ سے High Modernism کے عروج اور مابعد جدیدیت کے آغاز کا زمانہ کہا ہے۔

گوپی چند نارنگ اپنا موقف یہ رکھتے ہیں کہ:

''اردو ادب مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔''

جب کہ شمس الرحمان فاروقی یہ خیال کرتے ہیں کہ:

''ادبا کی موجودہ نسل کی تخلیقی سرگرمیاں اپنے رنگ ڈھنگ کے لحاظ سے جدیدیت کی علمبردار ہیں۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر انتہا پسندانہ ہیں۔ ابھی تفہیم مابعد جدیدیت کا سلسلہ جاری ہے جس نے ادبی وتنقیدی مباحث، الجھنوں اور وسوسوں کو جنم دیا ہے۔''

اردو میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے وزیر آغا کا نقطہ نظر معتدل اور خیال انگیز ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے اس میں ابھی زیادہ تر جدیدیت اور ہائی ماڈرنزم کے اثرات ہی پھیلے ہیں۔ گو مابعد جدیدیت کے اثرات بھی کسی حد تک در آئے ہیں، تاہم مابعد جدیدیت، مغرب کی سائیکی کی پیداوار ہے اور مشرق کی سائیکی سے الگ اور جدا مزاج رکھتی ہے۔''

گوپی چند نارنگ نے مابعد جدیدیت کی وضاحت کچھ یوں کی ہے:

''اس بارے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کسی ایک نظریے کا نہیں بلکہ کئی نظریوں یا ذہنی رویوں کا نام ہے اور ان سب کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی اور معنی پر بٹھائے گئے پہرے (اندرونی وبیرونی) کو رد کرنا ہے۔ یہ نئے ذہنی رویے، نئی ثقافتی اور تاریخی صورتحال سے بھی پیدا ہوئے ہیں اور نئے فلسفیانہ قضایا پر بھی مبنی ہیں گویا مابعد جدیدیت ایک نئی صورت حال بھی ہے۔''

پروفیسر نارنگ اپنی مقبول عام کتاب ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات میں جدیدیت کی اصطلاح اور تھیوری کے متعلق مابعد جدیدیت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''پس ساختیات کا زیادہ تعلق تھیوری سے اور مابعد جدیدیت کا معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورت حال سے ہے، تاہم ایسا نہیں ہے کہ مابعد جدیدیت کو تھیوری دینے کا بڑا حصہ وہی ہے جو پس ساختیات کا ہے۔ یعنی مابعد جدیدیت کے فلسفیانہ مقدمات وہی ہیں جو پس ساختیات کے ہیں۔''

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان جو بحث در آئی ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ آخر الذکر کے علمبردار اس کے اوصاف کو بہتر طریقے سے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اس وقت اردو کے تنقیدی مباحث کا مرکز مابعد جدیدیت ہے، جس کے حوالے سے آئے دن مباحث اور مناظرے ہوتے رہتے ہیں۔ دراصل یہ بحث یا مناظرہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین ہے۔ ایک گروہ جو حلقہ شمس الرحمٰن فاروقی سے وابستہ ہے، اس کا خیال ہے کہ اردو ادب ابھی مابعد جدیدیت کے دور سے گزر رہا ہے۔ ان کے خیال میں جو تھوڑی بہت تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ جدیدیت کی ہی توسیعی شکلیں ہیں، جب کہ حلقہ دوم کا جس کے پیش رو گوپی چند نارنگ ہیں، خیال ہے کہ اردو ادب مابعد جدیدیت کے دور میں شامل ہو چکا ہے چونکہ ان کے تصورات فکر ونظر اور مابعد جدید عالمی منظر سے منسلک ہیں۔

مابعد جدیدیت کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ نئی تنقید نظری کم اور عملی زیادہ تھی، مگر جو بھی ردعمل یا اس کے مخالف تنقیدی رویے متعارف ہوئے وہ اس کا الٹ تھے۔ ادب کو Theorise کرنے کے سلسلے میں مابعد جدید فکر نے ادبی نظریات کے برخلاف فلسفیانہ نظریہ سازی سے کام لیا ہے۔ بقول نظیر علی بدایونی:

''پس ساختیات ایک خصوصی مطالعہ (ادبی تھوری) ہے جب کہ مابعد جدیدیت کے مطالعے سے فکر ونظر کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

مابعد جدیدیت کسی ایک تھیوری کی ہر گز محتاج نہیں اور نہ ہی اس کی تشکیل میں محض جدیدیت کے بعد یا جدیدیت کے برخلاف ردعمل کے بطور پنپنے والے متعدد تصورات شامل ہیں بلکہ اس میں ثقافت وتمدن، صحافت و سیاست وغیرہ سے بننے والی فضا بھی عمل دخل رکھتی ہے۔

مابعد جدیدیت کسی واحد مستند متن کی پابند نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت فیصلے صادر کرنے یا فتویٰ جاری کرنے کے خلاف ہے چونکہ یہ

کسی کلیت اور مرکزیت کو نہیں مانتی اور مابعد جدیدیت وسعت، لامحدودیت اور تکثیریت کی علمبردار ہے چونکہ یہ ایک کھلا ڈلا ذہنی رویہ ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کا یہ جملہ قابل غور ہے:

''مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتحال ہے۔''

دراصل مابعد جدیدیت تخلیق کی آزادی اور تکثیریت کا فلسفہ ہے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی کے لفظوں میں:

''اگر ہم ادب کی تھیوری پر توجہ مرکوز کریں تو ہمیں مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات کے مترادف نظر آتی ہے اور جدیدیت سے اس کا مقابلہ کریں تو کہیں مکمل انحراف اور کہیں جدیدیت کی توسیع نظر آتی ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو میں مابعد جدیدیت تاخیر سے متعارف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی تحریک یا رجحان راتوں رات وقوع پزیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک دور ایک سوچ رہتی ہے جو بہ وقت ضرورت اپنے ہونے کا یعنی Existence کا احساس کراتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے پس منظر میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ تحریک یا رجحان ایک پل میں کئی مراحل سے گزر کر اپنے موجود ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی تحریک یا رجحان مغرب میں متروک ہونے لگتا ہے تو مشرق میں اس کی پزیرائی کا آغاز ہوتا ہے چونکہ مابعد جدیدیت سے اردو کی شناسائی نوے کی دہائی میں ہوئی جب کہ مابعد جدیدیت کے لئے فضا یا ماحول ہموار کرنے میں کلیدی رول ساختیات اور پس ساختیات تھیوری نے انجام دیا۔ ہمارے یہاں جب مابعد جدیدیت زیر بحث آئی تب مغرب میں مابعد جدیدیت اپنے جوبن پر تھی۔ تبھی کچھ لوگوں نے اسے ''مغرب کے چبائے ہوئے نوالے'' کہا۔ ہر تخلیق، ہر پیداوار یا ہر نئی چیز اپنے مناسب وقت کی منتظر ہوتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج اردو ادب مابعد جدیدیت کے فکری اور فنی زاویوں کا متقاضی اور متلاشی نظر آتا ہے۔

مابعد جدیدیت طاقت کے ایسے نئے وسائل، نئے مراکز اور نئے تصورات سے روشناس کراتی ہے جن کا جدیدیت میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مابعد جدیدیت میں تکثیریت، عدم تعین، اضافت کا جو ذکر ہوتا ہے وہ بڑی حد تک دریدا کا دیا ہوا ہے۔ اردو میں مابعد جدیدیت پر جس رفتار اور لگن کے ساتھ بحث و تمحیص جاری ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو تنقید میں مابعد جدیدیت خوب جگہ پا چکی ہے۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے دیوندر راسر لکھتے ہیں کہ:

''مابعد جدیدیت، مابعدالطبیعات، تاریخ کے مروجہ تصورات اور عقلیت کے خلاف ایسی طرز فکر ہے جس سے عہد حاضر کی فکر اور تہذیب بہت متاثر ہوئی ہے۔ مابعد جدیدیت اثباتیت، انسان پرستی، صداقت، حقیقت، آفاقیت، انسانی فطرت اور فطری جنسی اعمال، عقلیت اور مابعدالطبیعات کی نفی کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ کوئی بھی، کچھ بھی مستند نہیں۔''

جدیدیت کے سرگرم مفسرین ہی اصل میں اردو میں مابعد جدیدیت سے وابستہ نقاد ہیں۔ گوپی چند نارنگ اس بات کے سب سے بڑے داعی ہیں کہ مقامی اور عالمی سطح پر مابعد جدیدیت کا دور دورہ ہے۔ یعنی ان کے بقول جدیدیت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو ہمیں ایک دوسرے کی ضد نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ ایسے ہی جیسے مابعد جدیدیت ترقی پسندی کی ضد نہیں۔ ہمیں مابعد جدیدیت کو جدیدیت کا مدمقابل قرار دینے کے بجائے ہائی ماڈرنزم کا ردعمل قرار دینا چاہئے، اور مابعد جدیدیت کو ایک وسیع منظرنامے کے بطور دیکھنا چاہیئے جس میں جدیدیت، ہائی ماڈرنزم، ساخت شکنی سے مل جل کر ایک ایسی ادبی تھیوری کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ''ادبی تھیوری'' جو امتزاج پر مبنی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ وہ جدیدیت سے پھوٹ نکلی ہے۔ مابعد جدیدیت میں فنکار اپنی مرضی اور منشا کے تحت لکھتا ہے اور مابعد جدیدیت کے تحت فنکار کے پیش نظر کچھ نہ کچھ منشا ضرور ہوگا۔ مابعد جدید کو ہم محض بھول بھلیوں سے تعبیر کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں چند اچھی چیزیں بھی ہیں۔ ابھی چونکہ ہم پوری طرح جدید نہیں ہونے پائے تو کیسے آگے اونچی چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ جب کہ وزیر آغا مابعد جدیدیت، جدیدیت اور فوق جدیدیت (ساختیات) کو ایک ہی سفر کی تین منزلیں قرار دیتے ہیں۔ (بقیہ ص۶۹ پر)

نازنین فاطمہ
Research Scholar, Deptt. of Urdu, Veer Kunwar Singh University
Arrah, Bhojpur (Mob. 6207881560)

بہار کے لوک گیت: چند نکات

انگریزی زبان میں لوک گیت یا عوامی گیت کے لئے فوک سونگ (Folk Song) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے ''فوک سونگ'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عوامی گیت، روایتی گیت اور آہنگ جو عام لوگوں میں مروج ہوتے ہیں اور جن کے مصنفین کا نام عموماً نہیں ملتا۔''

اس تعریف میں تین الفاظ کلیدی ہیں۔عوامی، روایتی اور مصنفین ''عوامی'' سے مراد یہاں، پڑھے لکھے لوگ نہیں، بلکہ جمہور یا جنتا ہے جن کے لئے علم کی واقفیت کی شرط نہیں۔ دوسرا لفظ ''روایتی'' ہے۔یعنی ان گیتوں کے پیچھے ایک زمانہ ہوتا ہے یا ایک طویل مدت اور اُن کی اپنی ایک مسلسل روایت ہوتی ہے۔عوامی گیت کے مصنفین نامعلوم ہوتے ہیں یعنی ان گیتوں کے بنانے والوں کے نام ونشان کا کوئی اور چھور نہیں ملتا۔ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے یہاں یہ مختصر تمہید اس لئے ضروری تھی کہ لوک گیت کی خصوصیات کا تصور غیر واضح نہ رہے۔ لوک گیت ملک کے سبھی علاقے اور خطے میں رائج رہے ہیں۔ بہار میں بھی لوک گیت کی روایت موجود ہے۔مثلاً ؎

ٹونا مانگئے گئیں حضرت بی بی کے دروازے
بی بی دیو نا سہاگ، بھولی بھالی کا سہاگ
ارے میں نہ جانو، ٹونا کیسے لگا؟
ٹونا آنکھوں لگا، ٹونا پلکوں لگا، دل وجگرا لگا
جاہا جوہی لگا، بیلا، چمیلی لگا؟
اماں پیاری بنو ٹونا ایسے لگا......

یہ گیت روایتی گیت ہے۔ بہار کے مسلم گھرانوں سے اُن کا گہرا رشتہ انہیں گیتوں میں ہمارے معاشرے کی جھلکیاں ہیں۔لوک گیتوں میں نغمگی کا رس اور سادگی و پرکاری کا امتزاج ملتا ہے۔ ان میں بڑی حقیقت پسندی، معصومیت اور لطافت ہوتی ہے۔عوام کی سادہ زندگی کے لئے لوک گیتوں میں تفریح کا بے پناہ سامان بھی ہوتا ہے اور ان میں جذبات نگاری کی ایک بڑی دنیا بھی سجائی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ بڑی سچائی ہے اس بات میں، مگر اس سچائی کے باوجود مجھے یہ کہنے دیجئے کہ زندگی صرف پڑھے لکھے افراد سے ہی نسبت نہیں رکھتی بلکہ زندگی اُن کی بھی ہوتی ہے جو ناخواندہ ہیں اور ایک ادیب وشاعر صرف خواندہ افراد کی زندگی ہی کا ترجمان نہیں ہوتا، بلکہ ایسے افراد کی بھی ترجمانی کرتا ہے جو قلم کاغذ سے واسطہ نہیں رکھتے اور جن کے تلفظ اور جن کا روزمرہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں لوک گیت کی روایت پنپتی رہی ہے اور نسل در نسل اس کی مقبولیت کا سلسلہ جاری ہے۔

لوک گیتوں میں ہر موقع کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور دل کو لبھانے والے گیت موجود ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ میں جتنی ریت رسمیں ہوتی ہیں سب کے لئے گیت بھرے پڑے ہیں۔ مایوں بٹھانے کے وقت سے لے کر بچے کی پیدائش اور چھٹی چھلے تک سبھی مواقع کے گیت موجود ہیں۔ شادی کے گیتوں میں لڑکے اور لڑکی کی طرف سے تمناؤں اور ارمانوں کا کھلے طور پر اظہار ہوتا ہے۔

شادی بیاہ یا ریت رسموں کے لوک گیت کبھی اکیلے نہیں گائے جاتے۔ بہت سی لڑکیاں اور عورتیں مل کر، ایک ہی آواز میں، ایک ہی لے اور ایک ہی راگ میں گیت گاتی ہیں۔ ڈھول کی ہر تال کے ساتھ جب تک گیتوں کی ایک ہی لے میں جھنکار نہ ہو، لوک گیت کا احساس پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہی گونجتی اور لہراتی ہوئی خوشیوں بھری آوازیں

گانے والوں کی امنگیں بنتی ہیں اور سننے والوں کی راحتیں۔

عوامی گیت کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ان میں ''جوگ،ٹونا''، ''شہانہ گیت'' اور ''جھومر'' بہت خاص ہیں۔ جوگ اور ٹونا لڑکی کے گھر گائے جاتے ہیں،لڑکی والوں کا پہلے زمانے میں یہ خیال تھا کہ ٹونا کے گیت دولہا کو دلہن کا غلام بنائے رکھے گا، جیسے ؎

ٹیکے میں ٹونا کردو اماں
موتیوں میں ٹونا کردو
بنّا میرا مانگ دیکھے گا لاڈو کی اماں
ایسا ٹونا کردو
سنو جی اماں ایسا ٹونا کردو دلہن کی اماں
ایسا ٹونا کردو
کنگن میں ٹونا کردو اماں چوڑی میں ٹونا کردو
بنا میرا ہاتھ دیکھے گا،سنو جی اماں ایسا
ٹونا کرو
گوری کی اماں ایسا ٹونا کردو
بنو کی اماں ایسا ٹونا کردو

اسی طرح جوگ اور ٹونا گیت کے یہ بول بھی کچھ کم پیارے نہیں ؎

بھر سوپ ٹونا بھیجوں گی رے ابا پیاری کا دولہا
تجھ کو میں ٹونا کروں گی رے بھولی بھالی کا دولہا
ہاں ہاں رے چھوٹی لاڈو کا دولہا
بھر سوپ ٹونا بھیجوں گی رے
پیاری بنو کا دولہا
ہاں ہاں رے چھوٹی لاڈو کا دولہا

اور پھر یہ ٹونا گیت بھی دیکھئے کہ کتنا پیارا ہے ؎

اماں ہماری اصلی جوگنیاں
ابا ہیں جوگ کے سنگ
شہانے بنّے جوگ چلایا
جوگ چلے ہے آدھی رات
لاڈو کے بنّے جوگ چلایا
جوگ چلے ہے بھینی رات
بنو کے بنّے جوگ چلایا

ان گیتوں کے بول ٹھیٹھ دیہاتی بول ہیں۔گویا لوک گیت میں علاقہ علاقہ کی مقامی بولی اپنے خاص لہجہ کے ساتھ زندہ ہے اور اسی میں ان گیتوں کی مسلسل مقبولیت کا راز چھپا ہے۔

مضمون کے لحاظ سے ''جوگ'' یا ''ٹونا گیت'' کا رشتہ، جیسا کہ ذرا دیر پہلے کہا گیا، ایک خاص عقیدے سے ہے۔ یہاں لوک گیت کا جو نمونہ دیا گیا ہے، وہ اگرچہ بہار میں رواج رکھتا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ تھوڑے سے علاقائی لفظ، اس کے تلفظ اور لہجہ کے ساتھ جوگ گیت شمالی ہند میں کیا، دور دیس دکن تک پھیلے ہوئے ہیں اور شادیوں میں خوشی خوشی گائے جاتے ہیں۔ان گیتوں میں لاڈو یعنی دلہن کی ماں سے خطاب ہوتا ہے اور ٹیکہ، موتی، کنگن، چوڑی غرض کہ زیوروں اور بناؤ سنگار کے سامانوں پر ٹونا کرنے کی فرمائش ہوتی ہے اور بار بار یہ فرمائش دہرائی جاتی ہے، پھر دولہا کی طرف مخاطب ہو کر بھی سوپ بھر یعنی ڈھیر سارا ٹونا بھیجنے کی بات کہی جاتی ہے اور بنی کی ماں کو جادوگرنی اور باپ کو جادو کے ساتھ ہونے کا عقیدہ دہرایا جاتا ہے۔

ان جوگ گیتوں کی اپنی ایک تہذیب، اپنی ایک سوچ اور کسی حد تک اپنی ایک شگفتہ و پرمزاح ادا بھی ہے، ساتھ ہی ساتھ رشتہ کی جھلکیاں اور سمدھیانے کے مزاج کی لطافت بھی ان گیتوں میں نمایاں ہے۔

سہانے یا شاہانے گیت دولہا اور دلہن کو سنوارنے اور سجانے کے لئے ہوتے ہیں ان گیتوں میں زیوروں اور کپڑوں کی فرمائشوں اور اپنی تمناؤں کا خاص طور پر ذکر آتا ہے۔لڑکے کے لئے سہرا، جوڑا، گھوڑا اور گھونگھٹ والی لاڈو کی مانگ ہوتی ہے، جیسے ؎

موتی محل سے آیا میرا لال بنا
اونچے محل سے آیا میرا لال بنا
اپنے ابا کا گھوڑا لایا میرا لال بنا
اماں بی بی کا ڈولا لایا میرا لال بنا
سہرا سنوارتا آیا میرا لال بنا
عبا سنبھالتا آیا میرا لال بنا

اجیالی رین میں آیا میرا لال بنا
موتی محل سے آیا میرا لال بنا

برسبیل تذکرہ شہانے گیت کے کچھ اور بول بھی دیکھئے۔

شہانے بننے سہرے کی جلدی مت کرنا
مالی کے گھر سہرا سج رہا ہے
سہرے میں لڑیاں لگ رہی ہیں
سہانے دلھے جوڑے کی جلدی مت کرنا
درزی کے گھر جوڑا سج رہا ھے
جوڑے میں عطر لگ رہا ھے
شہانے بننے موٹر کی جلدی مت کرنا
پھولوں سے موٹر ڈھک رہی ھے
نبیلے بننے لاڈو کی جلدی مت کرنا
محل میں دلھن سج رہی ہے
محل میں گانا بج رہا ھے
محل میں لاڈو سج رہی ھے
صندل کا ابٹن لگ رہا ھے
مہندی کی لالی رچ رہی ھے
ٹیکے میں موتیا لگ رہا ھے
ہاتھوں میں کنگن سج رہا ھے
بنے تیری دلھن سج رہی ھے

اسی طرح یہ شہانہ گیت بھی اپنے پیارے پیارے بول سے سننے والیوں کے دل موہ لیتا ہے۔

جب دیکھو جب مالی گلی میں
ہو رہا ہے سہرے کا ہلا مچا دو
میرے بابو کے ہاتھ میں دو دو چھلہ
جیسی سالی ، ویسی سرہج
ویسا گیندوا ہے رے لوگو
سہورے کے باغ میں ہرمونیم باجا ہے لوگو
جب دیکھو جب درجی گلی میں
ہو رہا ہے جوڑے کا ہلا مچا دو
میرے بابو کے ہاتھ میں دو دو چھلہ
جیسی سالی ویسی سرہج
ویسا گیندوا ہے رو لوگو
سہورے کے باغ میں ہرمونیم باجا ہے لوگو
جب دیکھو جب ساسر گلی میں
ہو رہا ہے دلہن کا ہلا مچا دو
میرے بابو کے ہاتھ میں دو دو چھلہ
جیسی سالی ویسی سرہج
ویسا گیندوا ہے رو لوگو
سہورے کے باغ میں ہرمونیم باجا ہے لوگو

اِن میٹھے میٹھے، معصوم جذبوں سے بھرے گیت میں اگر کوئی شین قاف کی درست ادائیگی ڈھونڈنے لگے یا شاعری کا وزن، اس کی بحر وغیرہ تلاش کرنے لگے اور کتابی زبان نہ ملنے کا شکوہ کرے تو یقیناً یہ اس کا قصور ہوگا اور اس کے لئے زیادہ تر مایوسی کی سزا ہی مقدر ہوگی، ورنہ دیہی لہجہ اور مضمون سے سجے سجائے ان شاہانہ گیتوں میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ دولہا کی ماں کس طرح نسوانی طنطنہ یا گھمنڈ کے ساتھ اپنے بیٹے کی تعریف میں آسمان وزمین کے قلابے ملا رہی ہے۔

ان گیتوں میں خاندان کی حشمت اور اسباب سفر کا بیان بھی ہے اور لباس عبا وقبا اور سہرے کی شان وشوکت بھی۔ یہ شہانے گیت کیا ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ایک پوری زرق برق، تہذیب کا بیان ہے۔ یہاں دولہا اتاولا ہے اور اسے سمجھایا جا رہا ہے کہ جلدی مت کرنا، اس لئے کہ ابھی بنی کو سنوارا جا رہا ہے، پھر ان گیتوں میں مالن سے بھی بہت پیارا پیارا خطاب ہے۔ شادیانے کی محفل کا ایک ایک منظر اور ہنسی خوشی کے ماحول کا پورا پورا نقشہ ان گیتوں میں سمو لیا گیا ہے۔

ان گیتوں میں وہ تہذیب ہے جو صدیوں پرانی سہی، مگر آج بھی زندہ ہے اور صرف بہار یا کسی ایک علاقے میں کیا، ملک بھر میں یہاں سے وہاں تک ہر جگہ قائم ہے۔ ممکن ہے تھوڑے بہت فرق ہوں، مگر یہ گیت، یہ شہانے گیت آج بھی محفل میں اپنی تاثیر دکھا جاتے ہیں اور ایک مہکتی، چمکتی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

جوگ ٹونا اور شہانہ گیت کے بعد شادی کے گھروں میں سب سے آخر میں جھومر گایا جاتا ہے۔ جھومر بڑے دلکش، جذباتی اور رومانی لوک گیت ہوتے ہیں۔ نوبیاہتا اور نوجوان لڑکیاں جھومر کے گیت گاتی ہوئی خود ہی جھوم جھوم جاتی ہیں، جیسے ۔

پٹنہ شہرو اسے ٹکوا گڑھولی
کی آج من چل لی لے جیھل کھوان
لگ کئی پیر چھوڑل کی چوکیداروا
جو آنی دکھ دلکئی لے سیپہا
کی آج من چل لئی رے جیھل کھانوان

آیئے! جھومر کے کچھ اور بول بھی دیکھتے چلیں ۔

شیام سندر گگریا کیسے بھروں رے کیسے بھروں
کیسے بھروں شیام سندر گگریا کیسے بھروں
اُسی پنگھٹوا پر سسر جی کا ڈیرا
وہ تو مانگے گھونگھٹوا کیسے بھروں رے
شیام سندر گگریا کیسے بھروں
اُسی پنگھٹوا پر دیور جی کا ڈیرا
وہ تو مارے کنکھیا ، کیسے بھروں رے
شیام سندر گگریا کیسے بھروں رے
اُسی پنگھٹوا پر سیّاں کا ڈیرا
وہ تو پکڑے کلیا کیسے بھروں رے
شیام سندر گگریا کیسے بھروں رے

ان گیتوں میں شہر سے ٹیکہ جھمکا منگوانے کی بات نے گویا دیہی ماحول پر شہر کے خاموش اثرات کا پیغام دیا ہے۔ یہاں جان بوجھ کر انجان بننے اور سوال کرنے کا انداز ہی نہیں، روئے سوال بھی انتہائی پیارا ہے۔ ایک دلہن یہاں اپنی سسرال والوں سے مخاطب ہے اور پنگھٹ سے پانی لینے کا نہایت پیارا منظر آنکھوں کے سامنے پھیلتا جارہا ہے۔ اس منظر میں گاؤں کی دلہن کا سراپا ہی نہیں اس کی فطری اور تہذیبی شرم وحیا بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ کس طرح اپنے سسر، دیور اور سیاں جی کی نظروں سے بچ بچا کر اپنا کام کرنا چاہتی ہے۔ یہ گیت پنگھٹ اور گھونگھٹ کا عجیب حسین اور معصوم جذباتی منظرنامہ دکھارہے ہیں۔ مزید برآں اب جھومر کا ایک اور پیارا، گنگناتا گیت بھی دیکھئے ۔

جو میں ہوتی راجہ بن کی کوئلیا
کوہنک رہتی راجہ تورے بنگلے میں
نجر (نظر) لاگی راجہ تورے بنگلے میں
جو میں ہوتی راجہ جل کی مچھلیا
تڑپ رہتی راجہ تورے بنگلے میں
نجر (نظر) لاگی راجہ تورے بنگلے میں
جو میں ہوتی راجہ بیلا رے چمیلیا
چٹک رہتی راجہ تورے بنگلے میں
گمک رہتی راجہ تورے بنگلے میں
نجر (نظر) لاگی راجہ تورے بنگلے میں
جو میں ہوتی راجہ تورے دُلہنیا
چہک رہتی راجہ تورے بنگلے میں
نجر (نظر) لاگی راجہ تورے بنگلے میں

گیت کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بالکل قدرتی اور فطری جذباتی حوالوں سے ایک دلہن نے اپنے شوہر کے تئیں اپنی تمناؤں کے اظہار کی جھڑی سی لگا دیتی ہے۔ یہاں کوئل کی کوک کا حوالہ بھی ہے، مچھلی کی تڑپ کا حوالہ بھی اور چنبیلی کی خوشبو کا حوالہ بھی اور پھر وہ بنگلہ بھی جہاں وہ آواز، خوشبو اور تڑپ بن کر ایک جست میں پہنچنا، گونجنا اور پھیل جانا چاہتی ہے۔

اس میں یقیناً دورائے نہیں ہوسکتی ہے کہ یہ گیت جذبوں کا ایسا خوبصورت اور شاندار آئینہ ہے جسے سنگیت کی چمک یقیناً بڑی آسانی سے اور زیادہ ہی صیقل کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ برسبیل تذکرہ جھومر کا یہ گیت بھی دیکھئے ۔

چلو ری سکھی گنگا سے جل بھر آئیں
گنگا کنارے مالی بست ہیں
چلو ری سکھی گجرا گندھائے لئے آویں
چلو ری سکھی گنگا سے جل بھر آویں
گنگا کنارے حلوائی بست ہیں

چلو ری سکھی میٹھائی ملائی لئے آویں
چلو ری سکھی گنگا سے جل بھر آویں

یہاں دلہن اپنی سکھی سہیلی سے مخاطب ہے اور انہیں گنگا ندی سے پانی لانے کے لئے اپنے ساتھ چلنے کو بلا رہی ہے۔ یہ گنگا گھاٹ کتنا سجا سجایا ہے کہ یہاں مالی بھی رہتا ہے جس سے گجرا بنوایا جا سکتا ہے اور حلوائی بھی جس سے مٹھائی خریدی جا سکتی ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جھومر گیت میں گاؤں کی تفریح بھی ہے اور گاؤں کی زندگی کے ادب و آداب اور تہذیب بھی۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ جھومر گیت معصوم خواہشوں اور تمناؤں میں گویا گوندھے ہوئے ہیں اور ان کے بول میں عجیب سی زنانہ مٹھاس بھی ملتی ہے۔

لوک گیت چاہے، کسی علاقہ کے ہوں، بہرکیف ان میں ہندوستانیت رچی بسی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصل ہندوستان گاؤں گرام میں سانس لیتا ہے اور یہاں کے لوک گیت کا رشتہ اسی روایتی گاؤں گرام اور دیہات سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات اِس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ لوک گیتوں میں اصل ہندوستان اپنی پوری روایتوں کے ساتھ سانس لیتا، ہنستا، مسکراتا اور بسا اوقات کھلکھلاتا دکھائی دیتا ہے اور پورے ماحول کو ایک نیا رنگ دے جاتا ہے۔

دیہاتوں میں گرمی کی چاندنی راتیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ایسی حسین اور خاموش راتوں میں جب کہیں دور سے بانسری پر برہا کی دُھن سنائی دیتی ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ برہا فراق و درد کا گیت ہے۔ دیہاتوں میں چیت اور بیساکھ کی راتیں، ہندوستان کی رومانی اور خوبصورت ترین راتیں سمجھی جاتی ہیں۔ برہا اور بدیسیا بہاری عوام کے خاص گیت ہیں۔ ان گیتوں میں درد و سوز کے ساتھ کتنے تڑپتے ہوئے جذبات و احساسات ہوتے ہیں انہیں لفظوں میں نہیں سمویا جا سکتا، یہ تو بس سمجھنے اور محسوس کرنے ہی والی باتیں ہیں۔

جوگ، برہا اور پھر جھومر، گیت کی یہ ترتیب بڑی معنویت اور تاثیر رکھتی ہے۔ جوگ گیت، عوامی گیت کو عقیدے سے جوڑتے ہیں اور برہا گیت فراقیہ جذبے اور حزنیہ کیفیات سے، جب کہ جھومر کے گیت اُسے نشاطیہ کیف و کم کی طرف لے آتے ہیں اور اشارہ دیتے ہیں کہ عقیدے قائم رہیں تو چاہے تھوڑے وقت کے لئے درد و تڑپ کا موسم آ جائے، لیکن پھر وہ مسرت و رومان کے موسم میں بدل ہی جاتا ہے۔

گیتوں کا رشتہ یک گونہ بارہ ماسہ سے جڑا ہوا ہے اور اس میں بھی بڑی معنوی گہرائی ہے۔ اس طرح یہ گیت بدلتے موسم کے ساتھ بدلتے جذبے کے عکاس بنتے ہیں۔ لوک گیت میں اگر آہنگ کے لحاظ سے اشباع پسندی ملتی ہے یعنی حرکت کو طول دے کر حرف علت کے قائم مقام کر لیا جاتا ہے اور آوازوں کی صوتی قربت میں علاقائی زبان کے رواج کو ترجیح ملتی ہے تو یہ عیب نہیں بلکہ اس کا حسن، اس کی اپنی پہچان اور اس کی انفرادیت ہے۔ لوک گیت کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا تو یہ بھی اس کا انفراد ہے گویا یہ اس راستہ پر گامزن ہونے کی پہچان ہے کہ کس نے کہا تھا یہ نہ دیکھو، یہ دیکھو کہ اب یہاں کون کہہ رہا ہے، کس سے کہہ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ اس سے صرف اور صرف حال میں جذبے کے اظہار کی محویت اور تاثیر و معنویت بڑھتی ہے اور موسم کی روایت کی طرح اس کی روایت کا سلسلہ تازہ ہوتا ہے۔

سماج چاہے شہری ہو یا دیہی اس میں طرح طرح کے مواقع آتے رہتے ہیں اور علاقائی آبادیاں بھی طرح طرح کے قبیلوں، جرگوں اور ذاتوں کی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے بہار کے لوک گیت متنوع مواقع سے وابستہ ہو سکتے ہیں اور دور دراز علاقے سے بھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بعض گیت اپنا خاص انداز اور اظہار مفہوم رکھتے ہوں اور ان میں تہذیبی شوخی، فحش کلامی سے قریب آ جاتی ہو، لیکن بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے کہ بہار کے لوک گیت عام فطری جذبے کے معصوم اظہار اور پاکیزہ صاف ستھرے بول رکھتے ہیں اور ان میں مگھی، بھوجپوری اور میتھلی ہی نہیں بلکہ بعض دوسری علاقائی بولیوں مثلاً چھکا چھکی وغیرہ کے پٹ بھی ملتے ہیں اور بعض قبائلی علاقوں کی بولیوں کے اثرات بھی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہار کے لوک گیت میں بول کی جورنگا رنگی اور امتزاجی کیفیت ہے، علاقائی لہجہ کی بوقلموں شمولیت میں جو ایک خاص انداز کا توازن ہے اور اپنی مٹی سے جڑے ہونے کا جو مزاج ہے وہ بہرحال دیگر علاقائی لوک گیت سے اسے منفرد انداز میں الگ کرتا ہے اور ایک قابل رشک سرمایہ کہلانے کا حقدار بناتا ہے۔ ❁❁

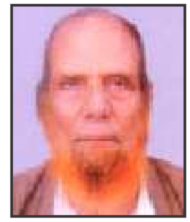

افسانے

محمد سلیم
4/3/H/39/1, Bhukailash Road, Kolkata - 700023 (Mob. 9231590390)

فطرت کا تقاضا

''ہمارا باغ...... پیارا باغ......
سب کی آنکھوں کا تارا باغ''

بچے صبح وشام باغ میں کھیلتے ہوئے صدا لگاتے۔صبح اسکول جانے سے پہلے اور شام کو لوٹ کر کچھ دیر کے لئے باغ میں کھیلتے اور اسکول کی تھکان دور کر کے تازہ دم ہو جاتے۔ہم سب کو اپنے اس باغ پر ناز ہے۔نسلوں سے اس پر ہمارا راج ہے۔ہمارے اسلاف کی خوبصورت نشانی ہے یہ۔ہم سب اس کے رکھوالے ہیں۔

رکھوالے تو ہم سب ہیں، مگر ایک دن ہم لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک خاص شخص کو اس کا ذمہ دار بنا دیا جائے تا کہ اس کی رہنمائی میں ہم سب مل کر اور بہتر طریقے سے باغ کی دیکھ بھال کریں۔کچھ بحث ومباحثہ کے بعد میرے ماموں جان کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا۔

ماموں جان اس انتخاب سے بڑے خوش نظر آئے، مگر ان کا کہنا تھا کہ جب انہیں منتخب کیا گیا ہے تو ان کو قانونی حیثیت ملنی چاہئے، لہٰذا ہم لوگوں نے اتفاق رائے سے عدالتی کارروائی کے ذریعے ان کو ان کی من چاہی حیثیت دے دی۔اب قانونی طور پر ماموں جان باغ کے مختار کل بن گئے۔

ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ ماموں جان کے اندر تبدیلی دکھائی دینے لگی۔ان کی چال بدل گئی۔خاندان کے تمام افراد کو وہ حقیر سمجھنے لگے۔خود کو بادشاہ اور ہمیں رعایا سمجھنا شروع کر دیا۔اب کسی کی کوئی بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔اپنی مرضی سے باغ کو جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔باغ کے پھولوں اور پھلوں کو بیچ بیچ کر کھانے لگے۔باغ کی ساری آمدنی اپنی مٹھی میں رکھتے۔

اس واقعہ کے بعد ماموں کے رہن سہن اور وضع قطع میں چار چاند لگ گئے۔قیمتی لباس پہننے لگے، ملکوں کی سیر کرنے لگے۔باغ میں کام کرنے والے ملازموں کو اپنا ذاتی خدمتگار بنالیا۔سارے ملازمین ان کے اشارے پر ناچنے لگے۔ماموں اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے اور ہم لوگ بے بسی اور لاچارگی کے ساتھ ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے۔ہم میں سے کوئی بھی ماموں کی اجازت کے بغیر باغ کا ایک پتا بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔

ایک دن ان کی کھوپڑی میں کیا سمائی کہ بولے:

''ہم اپنے باغ میں رنگ برنگ کے پھول پودے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ہم چاہتے ہیں کہ پورا باغ ایک رنگ میں رنگ جائے۔''

یہ نامعقول سوچ ان کے ذہن میں کیسے در آئی اور کیوں آئی، یہ تو وہی جانتے ہوں گے، مگر ہمیں ان کی یہ بات سن کر ہنسی آ گئی بہر حال وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔انہوں نے اپنے زرخرید غلاموں کو بلا کر کہا:

''سنو، باغ کے تمام رنگوں کے پودوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکو سوائے ایک رنگ کے۔ہم اپنے باغ کو خصوصیت کے ساتھ یک رنگی بنانا چاہتے ہیں جہاں کسی دوسرے رنگ کی گنجائش نہ ہو۔جاؤ پورے باغ میں پیلے پھولوں کے پودے لگا دو۔مجھے پیلا رنگ پسند ہے۔''

ماموں کے اس فیصلے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔خاندان کے تمام افراد نے اس فیصلے کے خلاف اعتراض کیا۔ماموں کی یہ تجویز کسی کو پسند نہیں تھی، یہاں تک کہ باغ کے باہر کے لوگوں نے بھی اسے رد کرنے کی اپیل کی، مگر ماموں نے کچھ لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ان میں ایک بارسوخ شخص کی انہیں بھرپور حمایت حاصل تھی اور یہ دونوں ایک جان دو قالب بنے ہوئے تھے۔دونوں نے پیلے رنگ کی حمایت کی اور دوسرے تمام رنگوں سے باغ کو محروم کر دینا چاہا۔

ہم لوگوں نے ڈاکٹر کوثر عالم سے جو ماہر نفسیات تھے ماموں

کے اس فیصلے کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ سن کر بولے:

''بڑے بڑے نفسیات کے مریض دیکھے ہیں، مگر ایسا نہیں دیکھا۔''

خاندان کے چھوٹے بڑے سبھوں نے ماموں سے اپنی ضد چھوڑنے کی درخواست کی۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی نے ماموں کو جھنجھوڑ کر کہا:

''دادا، آپ کیا پاگل ہو گئے ہیں؟''

ماموں اگر پاگل ہو گئے ہوتے تو ان کا علاج آسان تھا، مگر وہ پاگل نہ ہوتے ہوئے بھی پاگل پن کر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے انہیں سمجھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، مگر ہماری ساری باتیں ''چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل گئی۔'' ثابت ہوئیں۔

ماموں کو دراصل باغ سے دلچسپی نہیں تھی، اپنے آپ سے دلچسپی تھی۔ باغ کے تمام ذرائع آمدنی سے کافی فائدہ اٹھا چکے تھے اور اٹھا رہے تھے۔ وہ اپنی مالی پوزیشن مستحکم کر چکے تھے۔ باغ کے ذریعہ کمائی ہوئی رقم سے وہ مختلف کاروبار شروع کر چکے تھے، لیکن ہم لوگ ماموں کے غرض مندانہ اور احمقانہ فیصلوں سے اپنے پیارے باغ کو تباہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ہمارے چمن کو کوئی بگاڑے اور ہم تماشائی بنے دیکھتے رہیں، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ گرچہ ہم قانونی طور پر کچھ کرنے سے قاصر تھے، لیکن ہمارے اخلاقی دباؤ کا سلسلہ جاری رہا۔

ماموں جان ڈاکٹر اپیتا بھ سنہا کی شخصیت سے بڑے مرعوب تھے۔ سنہا جی ایک کالج میں علم نباتات کے پروفیسر تھے۔ ہم لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ ماموں کو اپنے اثر ورسوخ سے سمجھائیں۔

پروفیسر سنہا نے ماموں سے مل کر انہیں علم نباتات کی روشنی میں پیڑ پودوں کے متعلق ایک گھنٹے کا لکچر سنا دیا۔ انہوں نے بتایا:

''پودے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتے ہیں، ایک پودا تنہائی سے اوب جاتا ہے۔ پودے مل جل کر بہتر نشو نما پاتے ہیں۔ انہیں انسان کی طرح دکھ سکھ خوشی اور غم کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ پودے Parasite کہلاتے ہیں جو دوسرے پودے سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔''

ماموں نے ان کی باتوں کو بڑے غور سے سنا، مگر مزید جانکاری کے لئے کوئی سوال نہیں کیا۔ ان کو دوسرے تمام مضامین کی طرح اس سبجیکٹ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پروفیسر سنہا کو محسوس ہوا کہ ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔ ایک مختصر وقفہ کے بعد بولے: ''آخر آپ باغ میں ایک ہی طرح کے پھول دیکھنا کیوں چاہتے ہیں؟''

''پھول نہیں، پھول نہیں، میں رنگ کی بات کر رہا ہوں۔ میں اپنے چمن میں خصوصیت کے ساتھ ایک ہی رنگ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا تو آپ ایک اور صرف ایک رنگ دیکھنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں......!''

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں......؟''

''دیکھئے، آپ کسی بھی پھول یا پھل کے پودے لگائیں گے پتے تو ہرے ہوں گے'' پروفیسر سنہا نے ماموں کے دماغ سے رنگ کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور بولے:

''پتے کی اہمیت جانتے ہیں؟ پتا ہی پودے کی پرورش کرتا ہے۔ پتے میں سبز رنگ کا کلوروفل (Chlorophyll) نامی ایک مادہ ہوتا ہے جو پودے کے لئے غذا تیار کرنے میں مددگار ہوتا ہے اور یہی مادہ پودے کو توانائی بخشتا ہے، پھر باغ کے فرش پر دور دور تک ہری ہری گھاس کی مخملی چادر بچھی ہوئی ہے۔ کیسے بچ سکتے ہیں سبز رنگ سے؟''

اب ماموں کے دماغ پر پروفیسر کی باتوں کا گہرا اثر ہو گیا، وہ سوچ وفکر کے بحر عمیق میں ڈوب گئے۔ انہیں فکر مند دیکھ کر پروفیسر اپیتا بھ سنہا نے یہ شعر سنایا۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے ہر شب کو سحر کر

اور پھر ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اس شعر کا اشارہ سمجھ میں آیا آپ کو؟ نہیں تو یہ بھی سن لیجئے ۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو''

❋❋❋

رئیس صدیقی

Bungalow No.3, "Rahat Kada" 14 Green Valley Enclave
Airport Road, Bhopal - 462030 (Mob. 9810141528)

سوچ کا کرب

وہ ایک سرکاری دفتر کے اکاؤنٹ سیکشن میں کلرک تھا۔ پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ ہیڈ کلرک بن گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ بیٹی کی پیدائش اس کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔

کچھ عرصہ بعد، وہ مزید ترقی پا کر سیکشن آفیسر بن گیا اور اس درمیان ایک اور بیٹی کا باپ بھی، جس ڈپارٹمنٹ میں اس کی تقرری ہوئی تھی، وہاں، پہلے سے کہیں زیادہ اضافی آمدنی کے مواقع میسر تھے۔ وہ یہ سوچ کر بہت خوش تھا کہ اب وہ دونوں بیٹیوں کو کسی بڑے کالج میں پڑھائے گا، انہیں بڑا آفیسر بنائے گا اور اس طرح مالی اعتبار سے اس کا اور اس کے بچوں کا معیارِ زندگی بہتر سے بہترین ہوگا۔

وہ اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ مختلف طریقوں سے اپنے اور اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے لیے بچانے لگا اور اضافی آمدنی سے اپنے گھر کے لیے مہنگی اشیا جٹانے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ایک کار اور پھر گھر بھی خرید لیا۔ اب اس کی زندگی آسودہ ہونے لگی تھی۔ آسودگی تو حاصل تھی، لیکن اطمینان اور سکون ندارد۔

پہلے وہ آفس سے وقت پر سیدھے اپنے گھر پہنچتا تھا۔ پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد تو وہ چار بجے کے بعد سے ہی بے قرار ہونے لگتا۔ وہ بار بار دیوار پر آویزاں گھڑی پر نظر ڈالتا اور آفس کا وقت پورا ہونے پر، سیدھے اپنے گھر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی کو اپنی گود میں لیتا، اس کے ساتھ کھیلتا او اس طرح اس کی ساری تھکان دور ہو جاتی، مگر اب افسر بننے کے بعد، آہستہ آہستہ اس کی زندگی کا طرزِ عمل بدل گیا تھا۔ اب وہ آفس ٹائم کے بعد اپنے چند خاص ساتھیوں کے ساتھ دیر تک بیٹھنے لگا۔ اس کے ساتھی خصوصی قسم کی شراب کے ساتھ اعلیٰ قسم کے بھنے کاجو اور بہترین قسم کے مختلف نمکین کا اہتمام کرتے۔ دھیرے دھیرے یہ محفل تاش اور قمار بازی میں تبدیل ہو جاتی۔

اس محفل میں کوئی اپنی بیوی کا، تو کوئی اپنی سسرال کا، کوئی اپنے بچوں کا، تو کوئی اپنی بہو یا اپنے داماد کا قصہ سناتا۔ ان قصوں میں درد، کرب، مایوسی، محرومی، شکایت، خواہش، آرزو اور امید کی تڑپ ہوتی۔

اسی طرح وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا، اس کی بیٹیاں جوانی کی دہلیز پر قدم بڑھا رہی تھیں اور اب کمار بھی اپنی بیٹیوں کی شادی کی فکر اور مستقبل میں اپنی تنہائی کے بارے سوچنے لگا تھا۔ وہ کہتا کہ ماں باپ اپنی پوری زندگی اپنی بیٹی کے لیے جیتے، ان کو اعلیٰ تعلیم دلواتے، افسر بنانے کا خواب پورا کرتے اور کسی اچھے گھر، اچھے شوہر کے لیے فکرمند رہتے ہیں، مگر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جاتی ہے اور ماں باپ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک بیٹے کی کمی محسوس ہوتی ہے جو اس کے ساتھ رہے، اس کے بڑھاپے میں اس کا ساتھ دے۔ وہ اپنے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کے ساتھ خوش گوار بڑھاپا گزارے۔ ایسے موقع پر اس کے ساتھی مشورہ دیتے کہ ابھی بھی بیٹے کے لیے کوشش کر سکتے ہو۔ اس پر وہ اپنا مشاہدہ ساجھا کرتے ہوئے بتاتا کہ میں نے ایسے کئی گھر دیکھے ہیں، جہاں بیٹے کی چاہت میں چار چار بیٹیاں پیدا ہو گئیں اور ماں باپ کسی کے ساتھ بھی وہ انصاف نہ کر سکے، جو ان کا حق تھا۔

یہ سن کر، اس کا دوسرا ساتھی تسلی دیتے ہوئے کہتا:

’’آج کل بیٹی بیٹے میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔ بیٹی بھی نام کماتی ہے اور کسی بیٹے کی طرح ہی، بیٹی بھی خیال رکھتی ہے۔‘‘

کمار ’’ہوں‘‘ کہتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کرتا:

’’......لیکن میں اپنی بیٹی کے گھر میں دخل نہیں دینا چاہتا۔

(بقیہ ص ۶۹ پر)

منظومات

آصف احمد

Tarni Parsad Lane, Patna City - 800008

نعت پاک

لبوں پر ہو میرے ثنائے محمد
ہوں آنکھیں بھی محو لقائے محمد

وہ اعجاز نظروں کو دے یا الٰہی
دکھائی نہ دے کچھ سوائے محمد

ہوئے تو پیمبر جہاں میں بہت سے
مگر رب کو زیادہ ہی بھائے محمد

چھٹیں ظلمتیں ، آئی صبح بہاراں
جو دنیا میں تشریف لائے محمد

ازل سے مرا دل ہے بیمار طیبہ
اسے چاہئے خاک پائے محمد

اجازت دی جنت بنا کر خدا نے
اسے جیسے چاہے بسائے محمد

ہے جھولی میں جو کچھ بھی انسانیت کی
یہ سب با خدا ہے عطائے محمد

الٰہی ہے آصف ترے در کا عاصی
اسے بخش دے تو برائے محمد

❀❀❀

عظمت روح اعظم ہمارا نبی
نازشِ ابن آدم ہمارا نبی

یہ حقیقت ہے کوئی فسانہ نہیں
وجہ تخلیق عالم ہمارا نبی

کفر کے جو اندھیرے تھے سب مٹ گئے
وہ ہے نورِ مجسم ہمارا نبی

جس جگہ جا کے بے ہوش موسیٰ ہوئے
لوٹا اس در سے خرم ہمارا نبی

خود فرشتوں نے یہ قرب پایا نہیں
خلوت حق کا محرم ہمارا نبی

جس کی ہر اک ادا جان ایمان ہے
وہ حبیب مکرم ہمارا نبی

نام لیتے ہی سب رنج وغم مٹ گئے
سارے زخموں کا مرہم ہمارا نبی

ان دکھوں کی بھی آصف حقیقت ہے کیا
دور کرتا ہے ہر غم ہمارا نبی

❀❀❀

ڈاکٹر شبنم
Guest Faculty, Deptt. of Urdu, Patna University, Patna
(Mob. 7277576960)

تم زندہ ہو مجھ میں......

تم ہو، تم اب بھی ہو
میں ہوں، تم مجھ میں ہو
زندہ ہوں میں جب تک
تب تک تم مجھ میں ہو
موت جدا کر گئی ہے تمہیں مجھ سے
میرے ذہن کی موت ابھی باقی ہے
تم زندہ ہو مجھ میں، میں جی رہی ہوں
اب بھی کچھ سانسیں باقی ہیں مجھ میں
تمہارے چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی چمک
میری نظروں کے سامنے ہر پل حاضر ہے
یہ کہنے کو کہ تم زندہ ہو اب بھی مجھ میں
تمہاری ہنسی اور بولیاں گونجتی ہیں کانوں میں

یہ کہنے کو کہ تم زندہ ہو اب بھی مجھ میں
تمہاری یادیں سایہ بن کر ساتھ چلتی ہیں ہر پل
یہ بتانے کو کہ تم زندہ ہو اب بھی مجھ میں
میں چاہ کر بھی اپنے آنسو نہ روک پاؤں
کیسے خود کو سمجھاؤں کہ تم زندہ ہو اب بھی مجھ میں
تمہاری تصویر کہتی ہے مجھ سے کہ
تم زندہ ہو اب بھی مجھ میں
اُس کی یادوں کا صدمہ دل پر ہائے
جو گزری اسے کوئی کیسے بتائے
یہ حال اپنا وہی جان پائے
جس کا کوئی اپنا اس دنیا سے جائے

❁❁❁

ابیات زیبا

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے (میرؔ)
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر — ہے ذوقؔ برابر انہیں کم اور زیادہ (ذوقؔ)
دو روز ہے یہ لطف عیش و نشاطِ دنیا — بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں (آتشؔ)
کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں — کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں (شیفتہؔ)
سرؔوش اکثر پیامِ گل صبا سوئے قفس لائی — کہ آزادی کے خاطر ہمت پرواز پیدا کر (سروشؔ)
دامن یار سے جا لپٹے ہمارے آنسو — گر کے اس طرح سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے (شوقؔ نیموی)

غزلیں

فراؔق جلال پوری

Moh.- Qazipura, P.o. Jalapur, Dist- Anbedkar Nagar
Uttar Pradesh -224149(Mob.9758772746)

غموں کی تیز تر آندھی سے بھاگتی ہے خوشی
کہاں غریب کے آنگن میں رُک سکی ہے خوشی

یہ بند غم تو بقید حیات ہے اے دوست
وہ خوش نصیب ہے جس شخص کو ملی ہے خوشی

سمجھ لیا تھا غموں ہی کو جس نے سکھ اپنا
لبوں پر اُس کے ہنسی دیکھ کر جلی ہے خوشی

بغیر دھوپ میں نکلے، کہاں ہے چھاؤں کا لطف
بغیر خون پئے کس کو مل سکی ہے خوشی

یہ دنیا ، پہلے اُٹھاتی تھی دُکھ جو اوروں کے
اب اپنوں ہی کے ستانے کو جانتی ہے خوشی

خرید سکتا ہے پیسوں سے کون سکھ کی نیند
کسی امیر کی لونڈی نہیں رہی ہے خوشی

کھلونا چھین لیا جائے جیسے بچے سے
کچھ اس طرح سے مرے ہاتھ سے چھنی ہے خوشی

زمانہ گزرا مرے ہونٹ مسکرائے نہیں
نہ جانے دل سے کہاں روٹھ کر گئی ہے خوشی

فراؔق! سچ ہے بزرگوں کا قول یہ کتنا
ملے جو اوروں پہ مٹ کر وہی خوشی ہے خوشی

❀❀❀

مدہوؔش بلگرامی

224, Bahera Saudager, East Hardoi - 241001
(Uttar Pradesh) (Mob. 8726189282)

مری وفا کے تعلق سے واہمے رکھنا
اور انتظار میں ہرگام پر دیے رکھنا

ملو تو کھل کے ملو یہ بھی کیا تکلف ہے
حصارِ ذات کے اندر بھی دائرے رکھنا

مسیح وقت کبھی تو ادھر سے گزرے گا
سجے ہوئے سے خیالوں کے بتکدے رکھنا

نہ جانے کس گھڑی یادوں کے قافلے اُتریں
دیارِ دل میں اُجالوں کے سلسلے رکھنا

ہمیں پسند نہیں یہ ادا زمانے کی
کہ جس سے پیار کریں اس سے فاصلے رکھنا

پس غبار دکھائی دیا نہ جب کچھ بھی
ہمیں بھی آگیا شفاف آئینے رکھنا

ضرور لوٹیں گے وہ لوگ جنگ سے مدہوؔش
بچا کے ان کے لئے بھی تو مرتبے رکھنا

❀❀❀

شاہد اختر
Gaya College, Gaya - 823001 (Mob. 9939970616)

غزلیں

بیان ہونے سے قصہ ہی رہ گیا اپنا
زبان جم سی گئی لب نہیں کھلا اپنا
جدھر نہیں تھا رُخِ منزل صدا اپنا
اُدھر بھی رنگ تماشا بکھر گیا اپنا
اسی کی آگ میں جلتا رہوں گا شام بہ شام
بجھا نہیں ہے ابھی شعلۂ نوا اپنا
تری نگاہ نے ذرّے کو آفتاب کیا
وگرنہ دیدنی قصہ تمام تھا اپنا
یقیں سے کہہ نہیں سکتا کہ میں بھی ہوں موجود
مرا وجود سراسر ہے واہمہ اپنا
میں اپنے غم کو کھلونا بنا کے کھیلوں گا
اگر کسی سے یہاں دل نہیں لگا اپنا
کسی سے کوئی توقع نہ باندھئے اختؔر
نہیں ہے کوئی جہاں میں بجز خدا اپنا

❁❁❁

لگا نہیں جو تماشا کہیں لگا کے رکھو
سخن کا اپنے بھی سکہ یہاں جما کے رکھو
بہت اُبھرنے لگی ہیں انہیں دبا کے رکھو
ضرورتوں کو تم اتنا نہ سر چڑھا کے رکھو
بگڑ گئی تو خدا جانے کیا سے کیا کر دے
ہوا سے جتنی بنے عمر بھر بنا کے رکھو
تماشا کوئی نہ کوئی لگا رہے گا یہاں
کٹی پھٹی ہی سہی آبرو بچا کے رکھو
جدھر بھی دیکھئے پھرتی ہے منھ اُٹھائے ہوئے
اب اپنی طبع رواں کو بھی کچھ ڈرا کے رکھو
عظیم آباد میں بے دام بک نہ جاؤں میں
اب اس قدر بھی نہ قیمت مری گھٹا کے رکھو
نجات ہونی ہے اختؔر اسی کی برکت سے
نگار خانۂ لفظ و صدا سجا کے رکھو

❁❁❁

مطالع زیبا

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش
رہتی اک آدھ دن بہار اے کاش (میر تقی میرؔ)
خاک ہوں پر توتیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا (راسخؔ)
نہیں ثبات بلندئ عز و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے (ذوقؔ)
ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا
مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا (فانیؔ)

محمد شاہد پٹھان

1625, Hadi Manzil, Kamela Street, M.D. Road, Jaipur-302004
(Rajasthan) (Mob. 09372843907)

غزل

موسم گل ، چاند تارے ، کہکشاں تیرے بغیر
کچھ نہیں لگتا ہے اچھا ، جانِ جاں تیرے بغیر

کتنے سارے مسئلے ہیں ، کتنے سارے مرحلے
زندگی کے اور میرے درمیاں تیرے بغیر

راستے بھی گم ہوئے ، سب منزلیں بھی کھوگئیں
تھم گیا ہے ، زندگی کا کارواں تیرے بغیر

ہوگئیں رخصت ترے ہمراہ سب آسانیاں
زندگی لگنے لگی بارِ گراں تیرے بغیر

وہ سنہرے خواب تو ٹوٹے ہوئے مدت ہوئی
چن رہا ہوں حسرتوں کی کرچیاں تیرے بغیر

گھل گیا ہے زیست کی آب و ہوا میں زہر سا
روز و شب میں آگئی ہیں تلخیاں تیرے بغیر

کچھ خبر بھی ہے تجھے ، تیرے تغافل کے سبب
اک غزل خواں ہوگیا ہے نوحہ خواں تیرے بغیر

زندگی کا ہوتا تھا احساس تیرے قرب میں
زندگی وہ ہوگئی ہے ، رائیگاں تیرے بغیر

میرے حق میں کامیابی کی دعا کرنا ضرور
ہر قدم پہ دے رہا ہوں امتحاں تیرے بغیر

ہر طرف بکھراؤ ہے ، بے رنگ ہیں دیوار و در
گھر کا گھر ہے بے سماں، اے دل ستاں تیرے بغیر

پھل رہی ہے بس ترے الطاف سے کشت سخن
ورنہ شاہدؔ کیا ہے، کیا اس کا بیاں تیرے بغیر

❁❁❁

رباعیات
فرحتؔ قادری

کیا کیا نہ فریب ہم نے کھائے توبہ
امیدوں کے سو ناز اُٹھائے توبہ
سورج کی تمازت سے کہیں چین نہیں
تپتی ہوئی دیوار کے سائے توبہ

☆☆☆

دُھندلی سی نظر آتی ہے تصویرِ حیات
خوابوں سے بھی بے جان ہے تعبیر حیات
سانسیں نہیں ، چلتی ہوئی تلواریں ہیں
ہر آن کٹی جاتی ہے زنجیر حیات

☆☆☆

بے زر ہوں مگر شرم و حیا رکھتا ہوں
افلاس میں بھی ایک اَدا رکھتا ہوں
پھیلاتا نہیں ہاتھ کسی کے آگے
غربت میں بھی شانِ فقرا رکھتا ہوں

حنیف نجمیؔ

"Faisal Villa" Nayapara Ward, Dhamtari - 493773 (Chhattisgrah) (Mob. 7869292242)

غزلیں

کلامِ حضرتِ بیدلؔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا
سخن ان کا ہے بس مشکل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
تو خنجر بھی چلاتا ہے محبت بھی جتاتا ہے
ترا مقصد ہے کیا قاتل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
ہے روشن حق سراسر، دل کے اندھے پھر بھی کہتے ہیں
یہاں کیا حق ہے ، کیا باطل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
گہے باتیں ہوس کی گاہے عشق پاک کی باتیں
تو ہے کس چیز کا قائل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
وہ تنہا رو جنہیں تنہا روی پر ناز تھا اپنی
ہوئے کیوں بھیڑ میں شامل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
خداوندا جسے سمجھا تھا مردِ راہ داں میں نے
وہ خود ہے راہ سے غافل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
ہمارے شہر میں کوئی نہ رومی ہے نہ ہجویری
مگر پھر بھی ہیں سب کامل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
چلے تا عمر ، منزل پر نہ تم پہنچے نہ ہم پہنچے
ہوا کیا عشق سے حاصل سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اُسے پاکر بھی نجمیؔ میں عجب سی کشمکش میں ہوں
وہ ہے گرداب یا ساحل سمجھ میں کچھ نہیں آتا

❁❁❁

اَنا پر اپنی میں یوں ہی مسلسل وار کرتا ہوں
بھری محفل میں اپنے عجز کا اظہار کرتا ہوں
میں انساں ہوں مری فطرت میں چاہت بھی ہے نفرت بھی
کسی سے بغض رکھتا ہوں کسی سے پیار کرتا ہوں
جو شاطر ہیں بجھا لیتے ہیں دریا سے وہ پیاس اپنی
میں سادہ لوح دریا کا فقط دیدار کرتا ہوں
دعا مانگی تھی میں نے اس سے اک دن چھوٹ جانے کی
اُسی دن سے میں سو سو بار استغفار کرتا ہوں
کرامت عشق کی دیکھو کہ اپنی ہیر کی خاطر
میں اک کچے گھڑے میں روز دریا پار کرتا ہوں
سنا ہے میں نے گریہ سے منور قلب ہوتا ہے
سو میں یادِ خدا میں گریۂ بسیار کرتا ہوں
حسینی ہوں مگر مجھ پر بھی یہ الزام ہے ان کا
کہ روز و شب یزیدی فوج میں تیار کرتا ہوں
میں رہتا ہوں سدا مضمون تازہ کے تجسس میں
اسی خاطر میں سیر وادیٔ افکار کرتا ہوں
وفا اس کی تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں نجمیؔ
سو رسماً میں بھی اس سے عشق کا اظہار کرتا ہوں

❁❁❁

عمران راقمؔ

Grant Street, Kolkata - 700013 (West Bengal) (Mob. 9163916117)

غزل

سبھی پہ جان لٹاتا رہا سخی کی طرح
وہ کر رہا تھا محبت بھی دل لگی کی طرح

سبھی سے رابطہ اس کا ہے اک زمانے سے
مگر وہ ہاتھ ملاتا ہے اجنبی کی طرح

تمام گھر کے چراغوں کو ہی بجھا ڈالا
ہوا بھی آج چلی ہے تو سرپھری کی طرح

پڑی ہے اس کو بھی عادت حرام کھانے کی
سخی بھی ہاتھ پسارے ہے دفتری کی طرح

پرانی یاد خیالوں میں آگئی کیسے
فلک سے کون اُتر آیا ہے پری کی طرح

تلاش سر پہ گدھے کے جو سینگ کرتا ہے
بہت ہی تیز رہا ہے وہ لومڑی کی طرح

خیال اس کا ہر اک فصل میں رکھا ہم نے
ہمیں ہی بھول گیا وہ تو جنوری کی طرح

میں چاہتا ہوں اسے ٹوٹ کر اسی باعث
کہ میرا ساتھ سدا دے گا زندگی کی طرح

وہ جس کو چھونے کی خواہش رہی ہر اک ساعت
وہ مجھ پہ کپڑے سکھاتا ہے الگنی کی طرح

بتا رہا ہے وہی درد میرے زخموں کا
جو مجھ سے روٹھ گیا خود ہی اک خوشی کی طرح

یہ سانحہ کہ چراغوں کا جلنا بجھنا سا
نہ تیرگی کی طرح ہے، نہ روشنی کی طرح

رئیس فکر ہے راقمؔ سخن طرازی میں
نگاہ فن پہ وہ رکھتا ہے جوہری کی طرح

❁❁❁

رباعیات
نظمؔ طباطبائی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے
سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے
دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کر لیں
پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

☆☆☆

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے
اور طولِ امل فسوں و فسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہئے، غصہ سے گریز
وہ خوک ہے اور یہ سگ دیوانہ ہے

☆☆☆

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں
یعنی کہ مقدر میں کم و بیش نہیں
سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ
اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

مصدؔاق اعظمی

Via. Jawma, P.o.- Mejwa, Phoolpur, Azamgarh- 276304 (Mob.9451431700)

ہفت قطعات

تملق کے زمانے میں بھی صاحب مجھے قطعی کوئی حیرت نہیں ہے
بھرے دربار میں ناراض ہوگا وہی جو شخص بے غیرت نہیں ہے

❁❁❁

اپنی غزلوں میں ، اپنی نظموں میں جیتے رہنے کا اہتمام کیا
میں نے خود بے ادب زمانے میں اپنے شاعر کا احترام کیا

❁❁❁

وہی زمین وہی آسمان ہے لیکن یہ اور بات کہ اک جیسے دن اور رات نہیں
اس اتحاد میں ہے انتشار پوشیدہ ہم ایک گھر میں ہیں مصدؔاق پھر بھی ساتھ نہیں

❁❁❁

جنھیں خدا نے نوازا تھا عدل و حکمت سے انھیں کا ربط بہت ذات پات سے کم تھا
ہوس زدہ تھے وہ کشور کشا تو پھر مصدؔاق مجھے بتائے کیوں جزیہ زکوٰۃ سے کم تھا

❁❁❁

اس عشق حقیقی کی قسم آج بھی مجھ کو جب وقت کے نمرود سے خطرہ کہیں ہوگا
میں آگ کے دریا سے گزر جاؤں گا ہنس کر اللہ نے چاہا تو مجھے کچھ نہیں ہوگا

❁❁❁

وہ شب غم کہ جس کے حصے میں عشرتِ ماہتاب تھی ہی نہیں
میری تشنہ لبی کی قسمت میں میکدہ تھا ، شراب تھی ہی نہیں

❁❁❁

مرے لہجے کا مجھ میں کھردرا پن سانس لیتا ہے مرے غم خوار تھوڑی فکر ریشم سی مجھے دے دے
مجھے احساس ہے میں خود کو وہ لگتا نہیں جو ہوں نفاست کچھ دنوں کے واسطے اپنی مجھے دے دے

❁❁❁

سیمابؔ اکبرآبادی

قطعاتِ تاریخ

شہید وطن

تیس ماہِ جنوری جمعہ کا دن
ہوگیا ہندوستاں سارا یتیم
خون گاندھی ایک ہندو نے کیا
ہند پہ یہ آ پڑا وقت سقیم
گولیاں پیٹ اور سینے میں لگیں
کیوں نہ ہو جائیں یہ سن کر دل دو نیم
یوں کہو سیمابؔ سال عیسوی
خون صاحب جاہ انساں عظیم

۴۸ ع ۱۹

سولہ ماہِ ربیع الاوّل کو
خاک میں مل گئی امید وطن
شام جمعہ کو چل بسے گاندھی
حملہ آور ہوا یزید وطن
سالِ ہجری یہ لکھ دو اے سیمابؔ
مخلص و بے ریا شہید وطن

۶۷ ھ ۱۳

بدی پنچم بھی کیا تاریخ بد تھی
چھپا نظروں سے ناہید سیاست
تھی سولہ ماگھ ، شکر وار کا دن
محرم بن گئی عید سیاست
وہ گاندھی جس کے فیضان نظر سے
جواں رہتی تھی امید سیاست
کیا خون اس کا اس کی قوم نے ہی
یہ تھی کورانہ تقلید سیاست
کہوں سمبت میں سال فوت سیماب
ہوا مسمار خورشید سیاست

۰۴ بکرمی ۲۰

صباؔ جے پوری

ہیہات گاندھی

کون ہے ایسا کہ جو ہو دوست دار ملک و قوم
ایک موہن داس گاندھی تھے ہمارے دیس میں
جنوری کی تیس کو اُن کی شہادت ہوگئی
ہم نے بھی تاریخ رحلت ان کی لکھی ہے صباؔ
کون ہے ایسا جو ہو ہمدرد و یار ملک و قوم
جن کو دنیا جانتی تھی افتخار ملک و قوم
اس کے ہاتھوں جس کو کہئے نابکار ملک و قوم
اُٹھ گئے ہیہات گاندھی جاں نثار ملک و قوم

۰۴ بکرمی ۲۰

(عقیدت کے پھول، مرتبہ گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۵ تا ص ۱۶۰)

نام کتاب	:	افکارتاباں
شاعرہ	:	ڈاکٹرتبسم فرحانہ
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی
صفحات	:	۱۶۸ قیمت : ۲۰۰روپے
مبصر	:	منیؔر سیفی

ڈاکٹرتبسّم فرحانہ کا خوبصورت شعری مجموعہ ''افکار تاباں'' پیش نظر ہے۔ یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے برسوں پہلے ان کاشعری مجموعہ ''حروف زریں'' شائع ہوکرمقبول ہو چکا ہے۔

یاسمین اختری موضع :منڈو،ضلع :شیخ پورہ میں مشہورومعروف اورمعتبر شاعر فرحتؔ قادری کے گھر یکم جنوری ۱۹۶۸ءکو عالم وجود میں آئیں۔ ۱۹۹۵ء میں شعروسخن کے سنگلاخ میدان میں قدم رکھا اورتبسم فرحانہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔تبسم فرحانہؔ کی اولین تخلیق ''پالکا سماچار'' (۲۰۰۸ء) نئی دہلی میں اشاعت پذیر ہوئی تھی، پھرانہوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھااخبارات ورسائل میں تواتر سے شائع ہونے لگیں ع

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

کےمصداق خاتون خانہ کےعلاوہ ان دنوں وہ مرزاغالبؔ کالج ،گیا میں اسسٹنٹ پروفیسر (صدر شعبہ ہوم سائنس) کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔زیرنظرشعری مجموعہ ''افکارتاباں'' کی بابت شاعرہ لکھتی ہیں:

''میں 'افکارتاباں' کوابھی منظر عام پرلانے کے حق میں نہیں تھی، کیونکہ پہلی کتاب 'حروف زریں' کومنظرعام پر لانے کے لئے ہمیں جوجدوجہداورمشکلات کا سامنا کرنا پڑااس کی تھکان ابھی تک باقی ہے۔''

معتبر اہل نقدونظر نے ''حروف زریں'' اور''افکارتاباں'' کے لئے اپنے قیمتی تاثرات قلم بند کئے ہیں مثلاً پروفیسرعلیم اللہ حالیؔ نے لکھا ہے کہ:

''تبسم فرحانہؔ کی شاعری صحت مند دل ودماغ اورتوانا فکرو شعور سےمملو ہےان کے یہاں نسائی لہجے کے نام پر مجہول، ناتواں،مریضانہ اورفریادکناں اندازنہیں ملتا۔''

ڈاکٹرکلیم اخترقم طراز ہیں کہ:

''ہرشاعر کا انداز بیاں مختلف ہوتا ہے کوئی روایتی طرز تکلم پسند کرتا ہے،کوئی کلاسکی اسلوب سخن اپنا تاہے،کوئی جدید رنگ شاعری کا امین ہےاورکوئی مخلوط اسلوب وادا سے کام لیتا ہے،لیکن تبسم فرحانہؔ نے اپنے جذبات و خیالات کےاظہار کے لئے جوتخلیقی لہجہ اختیار کیا ہےاس میں کلاسیکی روایت کی پاسداری بھی ہے،ترقی پسندتحریک کی نعرہ بازی بھی اورجدیدیت کی جدت طرازی بھی۔''

پروفیسرمحمدمحفوظ الحسن نے دوٹوک لہجے میں پتے کی بات کہی ہے:

''ان دنوں شہرت کی بلندیوں پرپہنچنے کے لئے آپ کے رابطہ عامہ کوبہت وسیع ہونا چاہئے اوراس کے لئے جن حربوں کا استعمال کیاجاتا ہے اگروہ آپ کے قبضے میں نہیں ہیں توشہرت اورمقبولیت ملنے سے رہی۔''

میں پروفیسرصاحب سےصدفی صدمتفق ہوں اور مذکورہ تحریر میں ایک ذراسا اضافہ کرنا چاہوں گا، وہ یہ کہ ادبی دہشت گردی عرف غنڈہ گردی بھی ضروری ہےجوکوئی دہائیوں سے ہوبھی رہی ہے۔

تبسّم کی شاعری کےتعلق سے بدنام نظر نےلکھا ہے کہ:

''تبسّم کی شاعری کی کئی جہتوں پر بات کی جاسکتی ہے، جیسے کہ کلاسکیت،ترقی پسندی اورجدیدیت، ماورائے جدیدیت،نسائیت وغیرہ،لیکن ان پربات کرنے کے لئے لمباعرصہ چاہئے جوفی الوقت ممکن نہیں۔''

اوجؔ اکبرپوری (اب مرحوم) نےتبسم کونئےلب ولہجے کی شاعرہ کہا ہے۔

کیسی تصویر مصور نے بنا رکھی ہے
کاغذی پھولوں پہ شبنم کی ردا رکھی ہے
سارے آفاق پہ پھیلی ہے سیاہی کیسی
کس نے جلتے ہوئے سورج پہ قبا رکھی ہے

ڈاکٹر تبسم فرحانہ کے دوسرے شعری مجموعہ ''افکار تاباں'' کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اپنی پسند کے چند اشعار منتخب کئے ہیں، مثلاً ۔

بزم ادب میں شان تبسم تو دیکھئے
چہرہ ہے در نقاب غزل کی زمین پر

کیسے میں بے حجاب ہو جاؤں
روکتی رہتی ہے حیا مجھ کو

گزشتہ برسوں حجاب کے تعلق سے کئی شہروں میں خواتین کو شعبہ تعلیمات میں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جو خواتین کل باحجاب تھیں، وہ آج بھی ہیں، بلکہ خبر کے بموجب ایک باحجاب خاتون نے تو UPSC میں ٹاپ بھی کیا تھا ۔

اوروں سے یہ کم نہیں ہے پھر بھی کہنا چاہوں گی
صنف نازک تو مگر گھر بار سے منسوب ہے

شاعرہ جہاں گھر بار سے منسوب ہیں وہیں جیسا کہ ذکر آچکا ہے، وہ اسسٹنٹ پروفیسر (صدر شعبہ ہوم سائنس) کی حیثیت سے مرزا غالب کالج، گیا سے بھی منسلک ہیں ۔

ترے افکار کے شمس و قمر تارے چمکتے ہیں
تبسم تو مکمل آسماں معلوم ہوتی ہے

درج بالا شعر نسائیت کے اعتبار سے بہت بڑا شعر ہے، نیز یہ الفاظ ''مکمل آسماں'' بہت ہی معنی خیز ہیں، بطور خاص جب ایک عورت خود کو ''مکمل آسماں'' کہتی ہے تو ان الفاظ کی معنویت احاطہ تحریر میں لانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ''شمس و قمر تارے: مکمل آسماں'' پڑھتے ہی یکبارگی ذہن ہر زاویے سے ''بھرا گھرا'' کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مذکورہ بالا الفاظ ایک صحت مند، متمول فیملی کے غماز ہیں اور ہر عورت خواہ تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ ''شمس و قمر تارے: مکمل آسماں'' کا خواب ضرور دیکھتی ہے۔ میں اسے عورت کی معراج سمجھتا ہوں ۔

کیا ہوئی زمہریر کی چادر
آگ ہی آگ سارا عالم ہے

زمہریر یعنی کرۂ ہوا کا وہ طبقہ جو نہایت سرد ہے۔ مندرج بالا شعر برسوں قبل کہے گئے ہیں، لیکن آج بھی ان کی تازگی سے انکار ممکن نہیں۔ کئی مہینوں سے کرۂ ارض پر تاریخ کی سب سے بڑی نسل کشی (شیر خوار بشمول چھوٹے بچے، مستورات، ضعیف) ہو رہی ہے۔ اس تباہی کے سامنے ناگاساکی، ہیروشیما کی تباہی بہت کم پڑتی دِکھتی ہے۔ بالفظ دیگر یوں کہا جائے کہ کئی بڑے، لاکھوں کی آبادی والے گنجان علاقے تاخت و تاراج کر دیے گئے، لیکن وائے حسرتا! اہل زمہریر، نیرو کی طرح چین کی بنسی بجار ہے ہیں۔ اہل زمہریر کے چہروں سے اس طرح کا تاثر منعکس ہوتا ہے جیسے دنیا انہیں کی طرح گوشۂ عافیت میں ہے۔ ایک طرف بھوکے بچے گھاس کھانے پر مجبور ہیں، دوسری طرف اہل زمہریر رنگا رنگ جشن میں مشغول مرغ و ماہی اور انواع اقسام کی اشیائے خوردنی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔

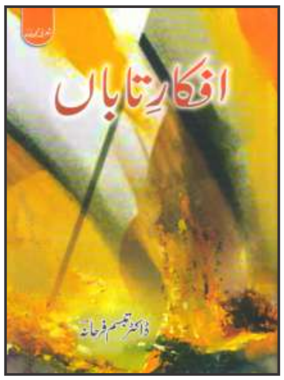

سارا گلشن جل گیا بارود سے
آشیاں ہے اب نہ شاخِ آشیاں

یہ شعر غزہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے ۔

ہے ہواؤں کی حمایت میں جو ننھی تتلی
یونہی آزاد خلا میں نہیں اتراتی ہے

تتلی کو کرۂ ارض پر رونما واقعات کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کہتے ہیں ''لکڑی کے بل مکڑی ناچے'' ایک بے یار و مددگار حقیر سا کیڑا جسے دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی تو اس نے خداترس قبیلے سے جائے اماں کی گزارش کی کہ ہم لٹے پٹے ہیں، ہماری مدد کی جائے۔ خداترس قبیلے نے اپنی اراضی پر بسا لیا اور حتی المقدور ہر طرح کی مدد بھی کی، لیکن اسی اثناء میں

تتلی کوفیل مست طوفان اوراس کے ہم نواؤں کا سہارامل گیا تو اس نے رفتہ رفتہ مزیداراضی پربھی قبضہ کرلیا، بالکل اس شعر کے مصداق ۔

ایک منصف نے کیا بے دخل کل جا گیر سے
اب کرایہ دار مالک بن کے میرے گھر میں ہے

مقبوضہ اراضی کی آزادی کے لئے چھ بارصف آرائی ہوئی اور ہر بارتتلی نے مزیداراضی پر قبضہ جمالیا۔تمام ضابطہ اخلاق کو پس پشت ڈال کر طوفان اوراس کے ہم نواؤں کے سہارے چھ دنوں میں چھ شکاری پرندوں کو نپٹا دینے کا عالمی رکارڈ تتلی نے اپنے نام کرلیا۔ظاہر ہے اس کی طاقت کی شہرت سے بازتو باز شاہ باز بھی مرعوب ہوگئے اوراس کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

کہتے ہیں تاریخ اپنے کو دوہراتی ہے۔ وقت کے ساتھ طوفان کمزور پڑنے لگا،جس لکڑی کے بل مکڑی ناچ رہی تھی،اس میں گھن لگنا شروع ہوگیا،تتلی کے سفید پروں پر حالات کی سیاہی نمودار ہونے لگی۔ کرۂ ارض کے دوتہائی پرندے اس سے بےاعتنائی برتنے لگے اور تاریخ کے اوراق میں مدفون واقعات، جو سو برس کے آس پاس تتلی پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے، ان کا چرچا عام ہونے لگا، یہاں تک کہ اس کا دن کا چین اور رات کا سکون غارت ہوگیا۔ہوا میں اُڑتے معمولی ذرّے بھی اس پر ایٹم کی صورت برسنے لگے۔

تتلی نے از حد مجبور ہوکر کرۂ ارض کے تمام پرندوں بشمول شاہ بازوں سے اپیل کی کہ مجھے اس نا قابل برداشت اذیت سے نجات دلائی جائے۔زیادہ تر شاہ بازوں بشمول دیگر شکاری پرندوں نے تتلی کو ضابطہ اخلاق کی یاد دلاتے ہوئے ’’بیک ٹو پیویلین‘‘ کا مشورہ دیا۔اب تتلی کے لئے کف افسوس ملنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا ۔

اپنی ہی خامیوں پہ جو ڈالی کبھی نظر
ایسا لگا کہ کچھ مرے اندر سے کٹ گیا

اپنی خامیوں کا محاسبہ اوراس پر ندامت نیک خوانسان کی پہچان ہے اور یہ ادا مالک حقیقی کو بھی از حد پسند ہے ۔

اسی سے حال مل جاتا ہے رفتار زمانہ کا
اٹھا کر آئینہ ہم اپنا چہرہ دیکھ لیتے ہیں

جام جم، جام جمشید یا جمشید کا پیالہ ـــــ بادشاہ جمشید کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حکمائے یونان نے جام جم بنایا تھا جس سے ازروئے نجوم ہفت آسماں کا حال معلوم ہوجایا کرتا تھا۔اسے جام جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ یہ تاریخ اور حساب کی مشہور کتاب کا نام بھی ہے۔کوئی بعید نہیں کہ شاعرہ کے لاشعور میں جام جمشید کا واقعہ رہا ہو،لیکن شاعرہ نے آئینہ اور چہرہ کہہ کر شعر میں گوناگوں معنویت بھردی ہے۔اسے کہتے ہیں اعلیٰ درجے کا جدید شعر۔مرزا غالبؔ تو بہت آسانی سے یہ کہتے ہوئے تپلی گلی سے نکل گئے کہ ۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لیکن شاعرہ نے یہاں آئینہ کو چہرے کے تغیرات کا عکاس بتایا ہے۔ شاعرہ آئینہ کے ذریعہ رفتارزمانہ کا حال معلوم کرلیتی ہے۔اس بات سے بھی انکارنہیں کیا جاسکتا کہ لوگ اپنے ٹیسٹ اوراپنی شعرفہمی کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی شعر کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگراسی طرح ڈاکٹر تبسم نے مطالعہ اور مشق سخن جاری رکھا تو وہ دن دورنہیں جب اُن کی شاعری سر چڑھ کر بولنے لگے گی، کیونکہ ان کے یہاں دیگر شاعرات کی طرح رومانی نسائیت نہیں ہے۔ان کی شاعری کسی ’’ازم‘‘ سے مرعوب بھی نہیں ہے، جوایک شاعرہ کے لئے نیک فال کہا جاسکتا ہے۔

نام کتاب	:	اردو کی برکتیں		
مصنف	:	جہانگیرانس		
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۱۹۲	قیمت :	۳۰۰روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر ارشاد احمد**		

جہانگیرانس (اصل نام مجیب الرحمٰن) ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ان کے ظریفانہ مضامین اردو کے موقر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں،لیکن یہ بات لائق تحسین ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو

مزاح نگاری تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بچوں کے لئے سبق آموز کہانیاں، بڑوں کے لئے خاکے، انشائیے، افسانے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ انہیں شاعری سے بھی شغف رہا ہے اور ان کی غزلیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک اہم بات یہ کہ انہوں نے سیوان کی دورافتادہ بستی رانی پور سے ۱۹۷۹ء میں ادبی صحافت کا آغاز کیا اور مسلسل دس برسوں تک ''شعلہ افکار'' کی اشاعت کی۔ فی الوقت درس وتدریس کے پیشے سے ریٹائر ہوکر گیسوئے ادب کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

جہانگیر انس کی ظرافت نگاری تقریباً پانچ عشرے کے لمبے عرصے پر محیط ہے۔ ابتدائی دور میں وہ معلوماتی اور علمی مضامین لکھتے تھے، لیکن احمد جمال پاشا نے انہیں ظرافت نگاری کی طرف مائل کیا اور چند ابتدائی تحریروں کی اصلاح کی۔ آج جہانگیر انس کی ظرافت نگاری دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ احمد جمال پاشا کے حقیقی وارث ہیں۔

پیش نظر کتاب ''اردو کی برکتیں'' جہانگیر انس کی دسویں کتاب ہے۔ یہ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے معروف مزاح نگار اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ قلم کار ڈاکٹر ظفر کمالی کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کتاب کے کل مضامین کی تعداد تئیس ہے۔ ان میں ''پیاز نامہ''، ''دنیا گول''، ''دربیان مونچھ''، ''ماڈرن حکیم''، ''مولوی نامہ''، ''عمر کی چوری''، ''کان کا قصہ''، ''ساری خدائی ایک طرف''، ''چمچے''، ''داڑھی کی باتیں'' اور ''ٹانگ مارنا'' وغیرہ ہندوستان کے مقبول ومعروف رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔

جہانگیر انس کے تخلیقی عمل میں طفل وجواں دونوں شامل ہیں۔ وہ مستند قلم کار کی طرح توازن برقرار رکھتے ہوئے میدانِ ادب میں بڑی خاموشی سے گامزن ہیں۔ ''اردو کی برکتیں'' کی ابتدا عبدالوہاب قاسمی کے تجزیاتی مضمون سے ہوتی ہے۔ اس میں انہوں نے جہانگیر انس کی ظرافت نگاری کے امتیاز و انفراد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد جناب انس کے ظریفانہ

مضامین کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ جہانگیر انس نے اپنے مضامین میں جہاں مزاح کو پرلطف طور پر پیش کیا ہے، وہیں طنز کا ہلکا نشتر بھی لگایا ہے۔ انہوں نے اپنے گردونواح کے سماجی حالات اور معاشرتی ناہمواریوں پر یوں گرفت کی ہے کہ قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چند مضامین میں انہوں نے اپنی ذات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ مظلوم اور ستم زدہ شخص کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور قارئین کو بہترین ظرافت کا احساس کراتے ہیں۔

زیر نظر کتاب کا پہلا مضمون ''اردو کی برکتیں'' کافی دلچسپ ہے، جس میں ایک سیاست داں جب انتخاب ہار جاتا ہے تو اردو کے فروغ کے لئے کام کرنے لگتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ محبّ اردو کے طور پر مشہور ہوجاتا ہے، اسے عوام کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور وہ دوسری بار بھی انتخاب میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ نئی سرکار میں اسے محکمہ تعلیم کا وزیر بنایا جاتا ہے۔ جب اس کے پاس اردو کی فائل آتی ہے تو وہ اس پر نوٹ لکھتا ہے:

''اردو بھی کوئی زبان ہے؟''

اس طرح جہانگیر انس نے نہ صرف اردو کی زبوں حالی کا المیہ بیان کیا ہے بلکہ جو حضرات اردو کے فروغ کے لئے مسندنشیں ہیں ان کی کارکردگی پر بھی سوالیہ نشان لگایا ہے۔

''پیاز نامہ'' بھی ایک دلچسپ اور پرلطف مزاحیہ تحریر ہے۔ پیاز سے سبھوں کا سابقہ ہے۔ کیا امیر کیا غریب؟ جہانگیر انس نے پیاز کی مختلف صورت حال، استعمال اور پیاز کے تعلق سے سماج میں مستعمل محاوروں کا تعارف کرایا ہے۔ وہ پیاز اور نیتا کی مماثلت کے چند پہلو ظریفانہ انداز سے یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پیاز اور نیتاؤں میں کافی مماثلت ہے۔ دونوں کا صرف ظاہر ہی ظاہر ہے۔ باطن پر نظر ڈالئے تو خلا کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔ پیاز کو چھیلتے جائیے مغز کے نام پر صفر نظر آئے گا۔ نیتا کا کینچل جیسے جیسے اُترتا ہے، آخر میں ایک سیاہ دھبے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ دونوں میں ایک مماثلت اور ہے، دونوں رُلانے میں

ماہر ہیں۔'' (اردو کی برکتیں، ص ۳۷)

جہانگیرانس کے مضامین کا کمال وہ مشاہدات ہیں جن کو بنیاد بنا کر اپنے مزاح کا انہوں نے خوبصورت محل تعمیر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جزئیات نگاری سے اس محل کی دلکش نقاشی بھی کی ہے۔ بیانیہ ایسا کہ قاری جب تک پورا مضمون پڑھ نہ لے تب تک دم نہ لے۔ زباں وبیان لطیف، الفاظ وتراکیب رواں اور انداز شگفتہ ہے۔

اس کتاب کے ''مولوی نامہ'' کو شہکار تحریر کہہ سکتے ہیں۔ جہانگیرانس نے اس مضمون میں مولوی کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ زیرلب مسکرادیں گے۔ اسی طرح ان کی متعدد قسمیں بتائی ہیں۔ جیسے خاندانی مولوی، خودساختہ مولوی، رکابیہ مولوی، رسیدی مولوی، بقراطی مولوی، تحریری مولوی، خانقاہی مولوی، اپٹوڈیٹ مولوی، قدیم مولوی اور جدید مولوی۔ اس کے بعد انہوں نے مولوی کی خوراک، تقریر اور قول عمل میں تضاد کا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مولوی جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ایک محفل میں مولوی صاحب تقریر کرر ہے تھے: 'اللہ نے جس دن اور جس وقت کے لئے جو رزق جس کی قسمت میں لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کررہے گا، اس لئے گھر میں ضرورت سے زیادہ چیزیں نہیں رکھنی چاہئے۔ کل کے لئے خدا ہے۔' اس محفل میں مولوی صاحب کی نصف بہتر یعنی مولویائن بھی موجود تھیں۔ اپنے تاجدار کی تقریر سن کر اتنی متاثر ہوئیں کہ گھر آ کر انہوں نے اپنا سامان غریب پڑوسیوں میں تقسیم کردیا۔ جب مولوی صاحب ماحضر تناول فرما کر گھر واپس آئے اور صورت حال سے واقف ہوئے تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور بیوی کو ڈانٹتے ہوئے کہا 'ارے کم بخت میری تقریریں دوسروں کے لئے ہوتی ہیں، اپنے لئے نہیں۔'' (اردو کی برکتیں، ص ۷۹)

جہانگیرانس نے اپنے مضامین میں حقیقت اور مبالغہ کے امتزاج سے پراثر مزاح پیدا کیا ہے۔ ''عمر کی چوری''، ''ماڈرن رخصتی'' اور ''کان کا قصہ'' اسی قبیل کے مزاحیہ مضامین ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ متوازن اسلوب، روانی اور تسلسل سے یہ مضامین قارئین کو اپنی گرفت میں لئے رہتے ہیں۔ اس کتاب کے دیگر مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ''اردو کی برکتیں'' کے مطالعے کے بعد عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہانگیرانس مزاح کے تمام جہتوں اور حربوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ان حربوں میں ڈرامائی واقعات، موثر بیانات، کردار کے تضادات اور شخصیت کے خرافات کا بیان شامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین ان کی دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی مقبولیت کی سند سے سرفراز کریں گے۔

نام کتاب	:	اکبررضا جمشید: کثیرالجہت شخصیت
مصنف	:	ڈاکٹر اے۔ کے۔ علوی
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۲ء
صفحات	:	۱۰۴ قیمت : ۲۰۰ روپے
مبصر	:	سلطان آزاد

پیش نظر کتاب ''اکبررضا جمشید: کثیرالجہت شخصیت'' انٹرویو (مصاحبہ) اور تاثرات کے اقتباسات پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے، جس کے مرتب ڈاکٹر اے۔ کے۔ علوی ہیں۔ اکبررضا جمشید کا تعلق ایک عرصہ تک عدالت عالیہ سے رہا ہے جو منصف وجج کے عہدہ پر فائز رہے۔ عدالت عالیہ سے تعلق رکھنے والے کئی اردو ادیب، شاعر اور دانشور گزرے ہیں۔ میری یادداشت میں فی الوقت دو نام آرہے ہیں اوّل م۔ احمد ایڈووکیٹ (سپریم کورٹ) اور دوم نندکشور پرساد نؔند (پٹنہ ہائی کورٹ) یہ دونوں ہی حضرات اردو کے اہم ادیب وشاعر گزرے ہیں۔

اکبررضا جمشید نے شروع سے اردو زبان وادب سے لگاؤ رکھا۔ غالبؔ اُن کے محبوب شاعر رہے۔ اس اعتبار سے غالبؔ پر ان کی دو اہم کتابیں منظر عام پر آ کر داد تحسین وصول کرچکی ہیں۔ اُن میں ایک کتاب ''غالبؔ خستہ جاں'' (سوانحی ڈرامہ) مطبوعہ ۱۹۹۰ء اور دوسری ''اسدؔ خستہ جاں'' (سوانح غالبؔ) مطبوعہ ۲۰۱۴ء ہے۔ ان کی خصوصی دلچسپی ڈراما نگاری سے رہی ہے۔

میں نے اکبر رضا جمشید پر ایک خاکہ بعنوان ''منصف سے مصنف تک'' میں ان کی ڈراما نگاری کے بارے میں لکھا تھا:

''وہ جس پیشے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی منصفی سے، وہاں ایک سے ایک ڈراماباز مجرموں اور گواہوں کا سامنا ہوتا رہتا ہے۔ مقدمہ کی پیروی کرنے والے وکلا اور حزب مخالف کے وکلا بحث و مباحثہ کے ساتھ بہت حدتک معاملات کو باریک بینی سے سمجھتے ہیں، گویا روزانہ اُن کے سامنے ڈراما کے ایک اسٹیج نہیں بلکہ کئی اسٹیج برپا ہوتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ ان کو ڈراما نگاری کی تحریک اسی پیشے سے ملی ہے، تبھی تو ڈراما نگاری ان کا محبوب ادبی مشغلہ بنا۔''

''بہار میں اردو ڈراما: آزادی کے بعد'' از ڈاکٹر محمد منصور انصاری (۲۰۰۰ء) میں بحیثیت ڈراما نگار، اکبر رضا جمشید کا تذکرہ شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد منصور انصاری نے اکبر رضا جمشید کی ڈراما نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

''بہار کی سطح پر آزادی کے بعد کے ڈراما نگاروں میں اکبر رضا جمشید کی حیثیت بہت ممتاز ہے۔''

ڈراما نگاری کی صورت میں ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں ان میں ''غالب خستہ جاں'' کے علاوہ ''بکھرے لوگ''، ''ہم رہے نہ ہم'' اور ''اسلام نامہ'' شامل ہیں۔ موصوف کی سوانحی کتابوں میں غالبیات کے علاوہ ادب کے حوالے سے بہادر شاہ ظفر سے متعلق ایک اہم اور دلچسپ کتاب بعنوان ''کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے'' بھی داد تحسین وصول کر چکی ہے۔ انہوں نے کئی دینی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور اپنے مسلک کے پیش نظر ایک مبلغ کا فریضہ انجام دیا ہے۔

اکبر رضا جمشید اپنی تصنیفات ہی نہیں بلکہ اپنے پیش کردہ ادبی ایوارڈ یعنی ''اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ'' کے لئے بھی مشہور ہیں۔ ان کے اُن دونوں کارناموں کی وجہ سے عظیم آباد کی کئی انجمنوں نے انہیں اعزازات سے نوازا ہے۔

پیش نظر کتاب ''اکبر رضا جمشید: کثیر الجہت شخصیت'' میں مصاحبہ کے علاوہ کئی اہم ادیبوں، دانشوروں کے وہ تاثرات بشکل نثر اور

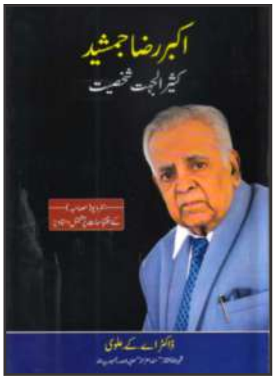

نظم شامل ہیں، جو ان کی کتابوں اور شخصیت پر گاہے گاہے لکھے جاتے رہے اور ان کی کتابوں کے اجرا کی محفل میں سامنے آتے رہے ہیں۔ جناب اکبر رضا جمشید پر لکھنے والے دانشوروں میں فخر الدین علی احمد، قاضی عبدالودود، مولانا کلب عابد، پروفیسر اجتبیٰ رضوی، شکیلہ اختر، مولانا اسد رضا، میجر بلبیر سنگھ، پروفیسر نذر احسن، سید شاہ نیرّ حسین، (جج پٹنہ)، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر شمشاد حسین، ریحان غنی، ریاض عظیم آبادی اور انوار الحسن وسطوی وغیرہ شامل ہیں۔ منظوم تاثرات میں ظفر صدیقی، منظر اعجاز، احسن راشد، کہکشاں توحید اور شکیل سہسرامی وغیرہ کے رشحات قلم ملتے ہیں۔

ڈاکٹر اے کے علوی کے ذریعہ لئے گئے انٹرویو میں اکبر رضا جمشید کے خاندانی حالات کے علاوہ اردو زبان کے مستقبل اور ادبیات میں شاد عظیم آبادی، جمیل مظہری، غالب اور بہادر شاہ ظفر کے متعلق بھی سوالات کے مدلل اور تفصیلی جوابات دستیاب ہیں جو اہم اور دلچسپ ہیں۔ محترم اکبر رضا جمشید نے عدالت عالیہ سے متعلق سوال کے جواب بھی اپنے تجربے کی روشنی میں دیا ہے۔

اردو کے مستقبل سے متعلق انہوں نے ڈاکٹر علوی کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

''اردو کا مستقبل بہ فضل الٰہی اچھا ہے۔ میں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ ہم اس کے مستقبل سے مایوس اس لئے ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ ہم صرف ہندوستان میں اردو کے متعلق سوچتے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ بین الاقوامی زبان ہے۔''

اردو کی فلاح و بہبود کے لئے اپنے کاموں سے متعلق ایک سوال کے جواب میں جناب اکبر رضا جمشید نے بتایا ہے کہ:

اردو کی فلاح و بہبود کے لئے میں نے اپنے بچوں کو اردو

پڑھوایا ہے جسے وہ اچھی طرح پڑھتے اور بولتے ہیں......
میرے تمام مضامین اردو میں ہوتے ہیں۔لوگ مجھ سے کہتے
ہیں کہ میں دوسری زبان میں بھی لکھوں، لیکن میں دوسری
زبان میں نہیں لکھتا۔اردو زبان سے مجھے محبت ہے۔''

زیرِنظر کتاب ''اکبر رضا جمشید: کثیر الجہت شخصیت'' کے مرتب صدارتی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر جناب اے۔کے۔علوی ایک اچھے اردو ادیب، اردو دوست، ماہر تعلیم اور سماجی کارکن ہیں۔مذکورہ کتاب سے پہلے ان کی دو اہم کتابیں بالترتیب ''بہار میں جدید غزل'' مطبوعہ ۱۹۹۸ء اور ''ظفر پیامی کا تخلیقی سفر'' شائع ہو چکی ہیں اور مقبولیت پا چکی ہیں۔اب ان کی پیشِ نظر کتاب ''اکبر رضا جمشید: کثیر الجہت شخصیت'' سامنے آئی ہے اور یقین ہے کہ یہ بھی اہلِ ذوق کے درمیان مقبولیت پائے گی۔ ❁❁

سوچ کا کرب (ص ۵۳ سے آگے)

میں نہیں چاہتا کہ وہ بار بار اپنا گھر چھوڑ کر ہماری سیوا کے لیے آئے اور وہ دو گھروں کے درمیان گویا کسی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پستی رہے۔

اس کا تیسرا ساتھی اسے یاد دلاتا کہ بوڑھے ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔تب کمار کسی فلسفی کی طرح اپنا تجربہ اور مشاہدہ بیان کرتا:

''دیکھتے ہی دیکھتے وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ ہمارے بڑھاپے کا وقت بھی بہت جلد آجائے گا۔میں نے کئی بڑے بڑے افسروں کو دیکھا کہ ان کا بڑھاپا گھور تنہائی میں گزر رہا ہے۔ دھیرے دھیرے ان کی یہ تنہائی نفسیاتی بیماری میں بدل گئی۔ میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں کہ اگر میری بیوی مجھ سے پہلے اس دنیا سے چلی گئی تو میرا کیا ہوگا۔ میں تنہا نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی بیٹی، اپنے داماد کے گھر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ایسی صورت میں میرا کیا ہوگا؟''

یہ کہتے ہوئے وہ سنبھل کر اٹھتا، اپنی کار کی طرف بہکے قدموں کو جما کر رکھتا، کار چلاتے وقت سڑک کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر کے دروازہ تک پہنچتا۔

یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ درحقیقت، اب اس کی سوچ کا یہ کرب، اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا تھا۔ ❁❁

فروغ فرخزاد: فارسی کی ایک...... (ص ۳۲ سے آگے)

''من از رنجهای که خواهر انم درین مملکت
دراثربی عدالتی هائی مردان می برند،کا ملا واقف
هستم وآرزوی من این است که مردان ایرانی
ازخود پرستی دست بکشند و به زنان هااجازه
دهند که استعداد و ذوق شان راظاهر سازند۔''

(ہماری بہنیں اس مملکت میں مردوں کی ناانصافی سے جس طرح رنجیدہ ہیں، میں اس سے بخوبی واقف ہوں اور میری آرزو ہے کہ ایران کے مرد خود پرستی سے باز آئیں اور عورتوں کو اپنی صلاحیتوں سے اظہار کا موقع دیں)

یعنی اس ملک میں مردوں کی ناانصافی کے نتیجے میں، اپنی بہنوں کے مصائب سے میں بخوبی واقف ہوں اور میری تمنا یہ ہے کہ ایرانی حضرات خود پرستی سے باز آجائیں اور خواتین کو اپنی صلاحیت اور اپنے ذوق کے اظہار کا موقع دیں۔ ❁❁

مابعد جدیدیت: ایک بیانیہ (ص ۴۵ سے آگے)

مابعد جدیدیت کی مخالفت میں سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ اس کی رو سے تجزیاتی مطالعات نہیں کئے گئے اور جو کئے گئے تو ان میں کوئی جدت نہیں ہے جب کہ یہ دونوں باتیں حقائق کے منافی ہیں۔گزشتہ دہائیوں میں مابعد جدیدیت کے موضوع پر خوب لکھا گیا ہے اور اس وقت بھی بڑی روانی اور تسلسل کے ساتھ لکھا جا رہا ہے۔ مابعد جدیدیت کو نئی لبرل ازم کا نام بھی دیا گیا ہے چونکہ یہ (مابعد جدیدیت) حدود سے عاری ہے جس کا نظریہ زمانی صداقتوں پر مبنی آئیڈیالوجیکل پر منحصر ہے جس میں بیانیہ کو دریافت کیا گیا ہے اور تجریدیت کو رد کیا گیا ہے۔ (اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت، گوپی چند نارنگ، مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات، وهاب اشرفی، جدیدیت، حسن عسکری اور مابعد جدیدیت: تاریخ و تنقید، رؤف نیازی سے خصوصی مطالعاتی استفادہ کے ساتھ) ❁❁

سلام و پیام

☆ دسمبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' نظرنواز ہوا۔حضرت قتیلؔ داناپوری کی نورانی تصویر، روحانی کلام اور عارفانہ تواریخ سے مزین تعارف پڑھ کر، دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔حضرت کے تعارف سے معلوم ہوا کہ حضرت کی پیدائش آج سے ۱۳۱ سال قبل ہوئی تھی اور اُن کی وفات آج سے ۳۹ سال قبل شاہ ٹولی داناپور، پٹنہ میں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب مختاراحمد خاں شگفتہؔ سہرامی ''ملت اردو ہائی اسکول'' کے پرنسپل تھے تو اسکول کے سالانہ جلسہ کے موقع پر جشن عیدمیلاد النبی کے پروگرام میں انہوں نے بطور خطیب حضرت شاہ قتیلؔ داناپوری کو مدعو کیا تھا۔ہلکی گرمی کا موسم تھا۔میں نے حضرت کا دیدار کیا،دوپہر میں ان کا پاؤں دابا اور حضرت کو وضو کا پانی دیا، پھر رات کے پروگرام میں حضرت کی عرفانی تقریر سے محظوظ ہوا۔اس وقت ملت اردو ہائی اسکول کے بچوں کی تعداد تقریباً تیرہ سو تھی اور اُس وقت وہ اسکول صرف لڑکوں کا تھا۔اس جلسہ میں شگفتہؔ سہرامی صاحب نے انتہائی خوش گلو آواز میں نعت شریف پڑھی تھی۔پیش نگاہ صفحہ پر دی گئی حضرت قتیلؔ داناپوری کی نعت شریف خاص طور سے محظوظ ومسرور کرگئی، یقیناً اسی کو استادانہ رنگ کہتے ہیں۔مقطع خوب ہے ؎

قتیلؔ بے سر و ساماں پہ بھی چشم کرم شاہا
غریبوں کے سہارا بیکسوں کے آسرا تم ہو

''زبان وادب'' کا زیرِنظر شمارہ ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔''مقالات''، ''افسانے''، ''منظومات'' اور ''کتابوں کی دنیا'' غرض کہ شمارے کا سبھی حصہ قابل مطالعہ ہے۔جاویدرانا صاحب کی غزلوں نے جی خوش کردیا۔اس شمارے میں دئے گئے تبصرے تعداد ہی نہیں بلکہ مطالعاتی ژرف نگاہی کے لحاظ سے بھی بہت معیاری ہیں۔تبصرہ نگاروں کا اپنا اپنا رنگ ہے اور سبھی رنگ اپنی اپنی جگہ باعث کشش بھی ہے۔ایک بار پھر اس شمارے کے حوالے سے یہ لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ اس میں حسین ترین اشاعتی تبدیلی خصوصیت کے ساتھ دیدہ زیب ہے۔سرورق پر کلیم صاحب کی تصویر ان کی ذہانت کی ترجمان ہے اور پس ورق پر مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کا مرقوم جوشؔ ملیح آبادی صاحب کا دستخطی قطعہ جوان کی اپنی تحریر میں ہے، بہت ہی خوب ہے۔اسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ گویا جوشؔ صاحب کی تحریر بھی بہت پختہ ہوتی تھی۔رسم الخط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت ''ہم نے'' کو ملا کر یعنی اس طرح ''ہمنے'' لکھا جاتا تھا۔یہ قطعہ عہدوعصر کا آئینہ بھی ہے اور اس میں جوشؔ صاحب کا رنگ تعلّی بھی جھلک رہا ہے اور استعارے و محاورے کی زبان بھی اپنی بہاریں دکھا رہی ہے۔اس شمارے کے ''فیلرز'' بھی جالب توجہ ہوئے۔نثری حصہ کے فیلرز ''کچھ باتیں تنقید کی''، ''قدرت کا بخشا ہوا اختیار''، ''ایہام اور اُس کی قسمیں'' پھر شعری حصہ کا پہلا غیرمنقوط نعتیہ فیلر ''سرورعالم'' اور دیگر فیلرز میں ''اشعار زیبا'' ساحرلدھیانوی کی ''آنکھیں'' اور ''خواتین کے اشعار زیبا'' بھی بے حد جالب نظر اور لائق اعتنا ٹھہرے، واقعی یہ فیلرز مطالعہ کے مختصر وقت میں بھی قارئین کے لئے باعث توجہ اور ان کی مطالعاتی تسکین کا باعث ہیں۔حسب روایت اس بار بھی ''بچوں کا زبان وادب'' اپنی کہانیوں، مضامین اور شعری تحفوں کے ساتھ یقیناً اپنے آپ میں بہت دلچسپ اور معیاری ہے۔

شکیلؔ سہرامی، پٹنہ

☆ مجلّہ ''زبان وادب'' دسمبر ۲۰۲۳ء باصرہ نواز ہوا۔چشم بددور! آپ نے لوح سے تمت تک بہت ہی خوبصورتی اور صحافتی ژرف نگاہی کے ساتھ اپنے ادارتی فرائض انجام دیا ہے، جس سے شمارے میں ایک خاص صوری اور معنوی وقار نمایاں ہوا ہے۔یہ اندازِ ترتیب فطری بھی ہے اور اصولی بھی کہ شمارے کی جس مہینہ سے نسبت ہو، اُس مہینہ میں ولات یا وفات پانے والے مشاہیر شعروادب کو خاص طور سے ترجیحی بنیاد پر یاد کیا جائے۔زیرنظر شمارے کے دونوں ہی بیرونی اور اندرونی سرورق کی تزئین میں آپ نے اس کا لحاظ رکھا ہے یا پھر دوسرے انداز سے یوں کہا جائے کہ سرورق اور اندرون صفحات کے مشمولات میں بہت ہی حسین تال میل دکھائی دے رہا ہے۔سابقہ شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی ''حرف آغاز'' مشمولہ مواد کے تعارف میں

ہرلحاظ سے کامیاب ہے۔ اردو زبان بیشک گنگا جمنی زبان ہے اور صرف نثریات ہی نہیں اس کی شعریات کو پروان چڑھانے میں بھی غیر مسلم ارباب سخن ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں ڈاکٹر ناصر رضا خاں جلالی کا مضمون ''اردو کے غیر مسلم شعرا کی ادبی کارگزاریاں'' نہایت اہم اور ذہن ساز مضمون کہلانے کا حقدار ہے، پھر یہ کہ اس میں معلوماتی مواد کی بھی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید صابر حسن بھی انشاءاللہ خاں انشاؔ کا شاعرانہ مقام دیکھنے اور دکھانے میں بہت کامیاب نظر آئے۔ ان دونوں مضامین کے علاوہ خاص طور سے مزید دو مضامین جالب توجہ ہوئے۔ ایک تو مولانا عبدالرزاق رضوی کا مضمون ''کلیم الدین احمد اور ان کی تنقید نگاری'' اور دوسرا ڈاکٹر آسیہ پروین کا مضمون ''جوشؔ: شاعری اور تنقید غزل'' رضوی صاحب کی تحریر کا وہ حصہ یقیناً اہم ہے جس میں کلیم صاحب کی تنقید نگاری کے مثبت اثر ونفوذ دکھائے گئے ہیں اور اسی طرح حضرت جوشؔ پر آسیہ صاحبہ کی تحریر کا وہ حصہ، جس میں انہوں نے جوشؔ کی غزل مخالف تحریر کا خلاصہ لکھا ہے اور اس کا مختصر تجزیہ بھی کیا ہے۔ میرے خیال سے کلیم صاحب اور جوشؔ ملیح آبادی پر یہ مضامین اس شمارے کے خصوصی مضامین کہلا سکتے ہیں۔ شوکت حیات کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹر احسان عالم نے بھی بہت اچھا مضمون لکھا ہے اور کئی اہم گوشے بڑی متانت سے اجاگر کر دیے ہیں۔ ''افسانے'' کے حصہ میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے ''ساڑھے آٹھ جملے'' کیا ہیں، یوں کہنا چاہئے کہ ایک پوری داستان ہے جو ہمیں بہت کچھ سنا جاتی ہے اور بہت کچھ سوچنے کی دعوت دے جاتی ہے۔ اسی طرح آپ نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ڈاکٹر شاہین سلطانہ کی کہانی ''ویڈیو کال'' میں ''آج کی اس ایجاد کے استعمال کا منفی نفسیاتی پہلو، نئی نسل کے اخلاق شکن رویے اور ممتا کی جذباتی و ذہنی تڑپ سامنے لا دی گئی ہے۔'' مزید برآں جہاں تک میرا احساس ہے، وانی صاحب کی کہانی میں عجب اور پندار کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا نفسیاتی خوف بھی ہے اور سلطانہ صاحبہ کی کہانی میں امریکہ پسند سوچ اور خواہش کا بھیانک انجام بھی۔ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں، یہ صرف کہاوت نہیں ہے بلکہ بسا اوقات یہ ایک حقیقت میں بھی ڈھل جاتی ہے اور اسے سلطانہ صاحبہ کی کہانی میں ہم یوں ڈھلتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں کہ ''خلد ولا'' سے ''ویڈیو کال...... ویڈیو کال، وقار......وقار......وقار'' کی آواز مسلسل آتی رہتی ہے۔ اس شمارے میں۔ ''منظومات'' کا حصہ بھی متاثر کر رہا ہے اور آپ ہی کے لفظوں میں ''نسبتاً پھیلی ہوئی 'کتابوں کی دنیا' بھی حظ وانبساط کا موقع'' دے رہی ہے۔ اس حصہ میں یہ کہنا چاہئے کہ ڈاکٹر اے کے علوی نے محترم صفدر امام قادری کی مرتبہ کتاب ''ظفر کمالی: شخصی اور فنی جہتیں'' پر تبصرہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ بظاہر یہ طویل ضرور ہے، مگر تلخیص و تجزیہ اور جامع اعتراف وتعارف کے تقریباً سبھی پہلو اس میں سمٹ آئے ہیں۔ اسی طرح م۔ اشرف کی کتاب ''وہ جو کہنا امر محال تھا'' پر ڈاکٹر بدؔر محمدی کا تبصرہ بھی بہت ہی معقول اور منصفانہ ومتوازن ہے، پھر ڈاکٹر آصف سلیم کا محترم آثؔر فریدی کی کتاب پر تبصرہ بھی پڑھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تبصرہ قدرے مختصر ہونے کے باوجود مبصر کی ژرف نگاہی کا پتہ دے رہا ہے۔ اس حصہ میں شامل دیگر تبصرے بھی عمدہ ہیں اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی حسب روایت نہایت اچھا ہے۔ اس حصہ میں دو تحریر خاص طور سے متوجہ کر رہی ہے ایک تو کائنات ضیا کا کہانی نما مضمون ''......جب دادی ماں نے سمجھایا'' اور دوسرا محمد ریحان کا تحریری تحفہ ''اِس اور اُس'' کی کہانی اس کی اپنی زبانی۔ ان میں ایک اخلاق آموزی کے لحاظ سے اور دوسرا قواعد آموزی کے لحاظ سے یقیناً بہت کامیاب ہے۔ یقیناً ان تحریروں سے بچوں کو بہت کچھ فائدے ملیں گے۔

شائستہ خاتون، پٹنہ

☆ دسمبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ ہمیشہ کی طرح اس شمارے میں بھی بچوں کا حصہ بہت خوبصورت اور بہت ہی کامیاب ہے۔ اس حصہ کی پہلی کہانی ''چڑیا کی چونچ'' مزیدار ہی نہیں بہت مزیدار ہے۔ اس کہانی کی شروعات بھی بہت پرلطف ہے۔ بچوں کی نوک جھونک اور آپسی تکرار نے اس کے ابتدائی حصہ کو سچ مچ بہت دلچسپ بنا دیا ہے اور بالکل اسی طرح اس کہانی کا خاتمہ بھی بہت پیارے، چونکا دینے والے اور اصل بات کو سمجھانے والے انداز سے ہوا ہے۔ بھلا ایک

چھوٹی سی ننھی منی چڑیا اور اس کی چھوٹی سی چونچ کی بساط ہی کیا، مگر کسی کے لئے بھلا سوچنے اور بھلا کرنے کا جذبہ ہو تو پھر وہ سب کچھ بھی عملاً ہو سکتا ہے جو عام طریقے سے یا عام حالتوں میں سوچا بھی نہی جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ خدمت خلق کی طرف دھیان دلانے والی یہ کہانی بہت ہی اثر دار ہے اور محترمہ نوشین تبسم نے اسے بہت پیارے انداز سے اور ہم بچوں کا خیال رکھتے ہوئے بہت ہی ہلکی پھلکی سادہ زبان میں لکھا بھی ہے۔ اس شمارے میں جناب مناظر حسن شاہینؔ کی نظم ''وقت'' بھی بہت اچھی لگی۔ بیشک ''وقت ایک قیمتی خزانہ ہے'' اور ''وقت ہی زندگی کا حاصل ہے۔'' پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زندگی، ان کی خدمات اور ان کی قیمتی نصیحتوں کے ساتھ محترمہ زیبا راشد نے جو مضمون لکھا ہے، وہ مختصر ہونے کے باوجود کافی معلوماتی اور کارآمد ہے۔ ''اِس اور اُس'' کے عنوان سے جناب محمد ریحان کی تحریر بھی بہت ساری معلومات دے گئی۔ اس میں ''اِس اور اُس'' نے گویا بچوں سے مخاطب ہو کر اپنا پورا پورا تعارف دے دیا ہے۔ زبان کی قواعد، محاوروں اور کہاوتوں کی جانکاری دینے والی ایسی تحریر کبھی کبھی ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہاں باتوں ہی باتوں میں گرامر کا ایک پورا سبق سمجھا دیا گیا ہے۔ جناب شجاع الدین شاہدؔ کی نظم ''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' بھی خوب ہے۔ مجھے یہ صرف اپنے مزاحیہ طرز کی وجہ سے پسند نہیں آئی بلکہ اس لئے بھی بہت اچھی لگی کہ اس میں شاعر نے ایک بڑا سبق یاد دلایا ہے، وہ یہ کہ گھر سے روٹھ کر اور گھر والوں کی نصیحت سے گھبرا کر یا اسے ٹھکرا کر بھاگنے والوں کو ہمیشہ پچھتانا پڑتا ہے۔ اس شمارے میں آخری تحریر محترمہ کائنات ضیا کے قلم کی سوغات ہے، عنوان ہے ''...... جب دادی ماں نے سمجھایا'' یہ اصل میں فضول گوئی کے نقصانات پر ایک پورا مضمون ہے جس کو کہانی کا انداز دیا گیا ہے۔ اس میں باتیں کچھ لمبی ضروری ہوگئی ہیں اور کہیں کہیں کچھ زیادہ گاڑھی بھی، جیسے وہ ''مکثار'' اور ''مہذار'' والے عربی محاورے کا ذکر، لیکن اس کے باوجود اس کے موضوع اور مواد کی فائدہ مندی سے انکار کا سوال نہیں۔ اسے غور سے پڑھ کر خاموشی کے فوائد پر ایک اچھا مضمون لکھا جا سکتا ہے اور امتحان میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ دُعا ہے کہ ہم ''بچوں کا زبان وادب'' اسی طرح ماہ بہ ماہ نکھرتا، سنورتا، نکلتا رہے۔ آمین!

محمد ارفاق، بہار شریف

☆ رسالہ ''زبان وادب'' اپنے علمی وادبی اعتبار سے جہانِ علم وادب میں پہلے سے کہیں زیادہ معتبر ہو گیا ہے اور آپ کے نظم ونسق میں اس کا طباعتی حسن بھی نکھر گیا ہے۔ خصوصاً ماہ اکتوبر ۲۰۲۳ء کا شمارہ اپنے نہایت دیدہ زیب سرورق سے ہی نہیں اپنے افسانوں کی وجہ سے بھی بڑا پرکشش ہو گیا ہے۔ اس میں معروف افسانہ نگاروں کے افسانے آفاقی نوعیت کے ہیں۔ ان میں گنگا جمنی تہذیب کا پرتو بھی ہے اور انسانی ہمدردی اور ہماری سیکولر روایت کی آواز بھی۔ قدرے جدید رنگ کے ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات بھی روشنی ہو جاتی ہے کہ تخلیق کار اس کے ماحول اور مسائل سے نہ صرف واقف ہے بلکہ اس کے قریب بھی ہے۔ افسانے آپ بیتی بھی ہوتے ہیں اور جگ بیتی بھی۔ افسانہ نگار اپنی کہانیوں کا نقش ونگار اپنے ماحول اور اغل بغل سے ہی تو تراشتا ہے۔ اپنی زندگی ہو یا غیر کی یا پاس پڑوس کی، زندگی بذات خود کہانی ہے جو بغیر کسی طمع ولالچ کے ہر لمحہ کاغذی لباس زیب تن کرنے کو تیار رہتی ہے۔ بس تخلیق کار لکھ کر جیتا ہے یا یوں کہیئے کہ جی کے لکھتا ہے۔ صفحہ ۵۵ کی غزلیں بار بار پڑھا کہ یہ ایک بڑے اور بلند درجے کے نثر نگار (شہاب ظفر اعظمی) کی شعری نمائندگی کر رہی ہیں۔ شمارے کے شعری حصے کا سلیکشن حسب سابق بہت عمدہ ہے۔

نذیر احمد یوسفی، آسنسول

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	نیا سال آیا	محمد اسد اللہ	۷۴
☆	شرافت کا لباس	ڈاکٹر بانو سرتاج	۷۵
☆	آواز کے لچھن	بینش فردوس	۷۶
☆	یومِ جمہوریہ	پرویز اختر	۷۸
☆	سعدیؔ شیرازی	نزہت پروین نزہتؔ	۷۹
☆	سردی کا موسم	رخشاںؔ ہاشمی	۸۰

محمد اسد اللہ
30 Gulistan Colony, Near Pande lawns, Nagpur - 440013 (Mob. 9579591149)

نیا سال آیا

نیا سال دامن میں لایا اُجالے
پھر آنکھوں میں اُترے ہیں سپنے نرالے
گگن بھی وہی ہے ، یہ دھرتی وہی ہے
مگر سوچ اس بار بدلی ہوئی ہے
وہی لوگ ہیں اور دنیا وہی ہے
مگر کچھ پرانی سی لگنے لگی ہے
نیا دن نئے پن کا احساس لایا
بہت دور تھا جو اُسے پاس لایا
محبت کے دریا امنگوں کے جھرنے
لگے آرزوؤں کی یہ گود بھرنے
نئے سال کی ایک خاموش بستی
مہکتی ہوئی شام اُجلے سے دن کی
اجالوں بھرے دن مہکتی یہ شامیں
نئے سا ل کے ساتھ آشا کی کرنیں

❀❀❀

سالِ نو مبارک

کیلنڈر ۲۰۲۴ء					جولائی	دیکھنے کا طریقہ: پہلے مہینہ، مہینے کے نیچے دن، پھر دائیں جانب تاریخ					
					اپریل	☆	☆	اگست	نومبر	☆	دسمبر
					جنوری	اکتوبر	مئی	فروری	مارچ	جون	ستمبر
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعہ	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	سنیچر	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	اتوار	سوموار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر

کاوش: کاشف غفران، پٹنہ

ڈاکٹر بانو سرتاج

Jindran Nagar, Near Ist Mseb Tower, Pandharkawada Road, Yavatmal- 445001

شرافت کا لباس

ایک تھا چڑا، ایک تھی چڑیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے یہاں بچوں کی آمد آمد تھی اور وہ گھونسلہ بنانے میں جی جان سے جٹے تھے۔ ایک دن آرام کرنے کے لئے وہ دونوں درخت کی نچلی شاخ پر بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ چڑے نے کہا:

''جب انڈوں سے ہمارے بچے نکل آئیں گے تو تم آرام کرنا۔ دانہ دنکا لانے کی ذمہ داری میری ہوگی۔''

چڑیا نے محبت بھری نظروں سے چڑے کو دیکھا اور بولی:

''تمہیں بھی تو آرام کی ضرورت ہوگی۔''

''تمہیں بچوں کی حفاظت اور ان کی دیکھ بھال بھی تو کرنی ہوگی، اس لئے تمہیں آرام کی ضرورت بھی زیادہ ہوگی۔''

''سنو جی!'' چڑیا نے جوش سے کہا: ''میں نے سوچ لیا ہے کہ کچھ وقت دوسروں کو بھی دوں گی۔ میں دوسرے پرندوں کے بچوں کی دیکھ بھال کروں گی۔ اپنے بچوں کے ساتھ انہیں بھی پیار دوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے مل کر رہنا چاہیے، ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے۔'' چڑے نے چڑیا کو شاباشی دی۔ ''ارے! دیکھو جی......ایک آدمی اس طرف آرہا ہے۔ چلو اُڑ کر اونچی شاخ پر بیٹھ جاتے ہیں، ورنہ یہ ہمیں مار ڈالے گا۔'' چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ چڑے نے اس طرف دیکھا اور بولا:

''یہ آدمی شریف لگتا ہے۔ اس کی صاف ستھری اور سلیقہ سے بندھی ہوئی دستار دیکھو، اجلے سفید کپڑے دیکھو......شکل سے بھی شرافت ٹپک رہی ہے۔ یہ ہمیں بھلا کیوں مارے گا؟''

چڑے نے ہاتھ بڑھا کر چڑیا کو تسلی دی۔ اتنی دیر میں وہ شخص نزدیک آگیا۔ بڑی سرعت سے تیر کمان نکال کر اس نے تیر چلا دیا۔ تیر چڑے کو لگا۔ وہ فوراً زمین پر گرا، گر کر مر گیا۔ چڑیا نے واویلا مچا دیا۔ ساتھی دوڑے، اس شخص کو پکڑ لیا۔ چڑیا نے ہمدردوں کی مدد سے بادشاہ کے دربار میں فریاد کی۔ بادشاہ نے چڑیا سے کہا: ''میں تمہیں اختیار دیتا ہوں، جو سزا دینا چاہو اس شخص کو تم خود دو۔''

چڑیا نے ایک لمحہ، بس ایک لمحہ سوچا اور کہا: ''اس سے کہہ دیا جائے کہ اگر وہ شکاری ہے تو شکار پر نکلتے وقت شکاریوں کا لباس پہنے۔ شرافت کے لباس میں جنگل میں نہ آیا کرے۔'' ❁❁

خواجہ اجمیری کا پیغام

پیارے بچو! ہندوستان ہمیشہ سے صوفیوں اور سنتوں کی دھرتی رہا ہے، جنہوں نے یہاں انسانیت اور محبت کا پیغام عام کیا۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں ۱۱۹۲ء کا سال بڑا ہی یادگار ہے، اسی سال مشہور صوفی بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر کی دھرتی پر قدم رکھا۔ وہ لگ بھگ ساٹھ برس کی عمر میں یہاں آئے تھے اور لگ بھگ چالیس برس یہاں گزار کر یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ انہیں دنیا ''غریب نواز'' کے لقب سے یاد کرتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ہمیشہ ہی خاص طور پر غریبوں اور کمزوروں کو اوپر اٹھانے کے لئے کام کیا اور طرح طرح کی بھلائی کا پیغام دیا۔ حضرت خواجہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور مبلغ و مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے مفکر، مصنف اور عظیم شاعر بھی تھے۔ ان کے اقوال کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جو شخص اپنے پالنہار کو یاد نہیں کرتا، وہ حرام روزی کھاتا ہے، بھائی کو ذلیل اور حقیر سمجھنے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ کسی بڑے گناہ سے بھی بڑا نقصان ہے اور یہ کہ یقین ایک ایسا نور ہے جس سے انسان منور ہو جاتا ہے۔ جھوٹی قسم کھانے سے گھر کی برکت جاتی رہتی ہے اور وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چند چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن زندگی کو سنوارنے والی باتیں ہیں۔ اللہ کی یاد، بھائی چارہ، ایمان و یقین اور جھوٹ سے بچنا ہر حال میں ضروری ہے اور یہی خواجہ اجمیری کا پیغام ہے۔

بینش فردوس
Sultanganj, P.o. Mahendru, Patna - 800006 (Bihar)

آواز کے لچھن

''بادل کی گرج، ندی نالوں کا شور، چڑیوں کی چہچہاہٹ ......مت پوچھو وہاں ایک عجیب فضا تھی۔''

پیارے بچو! یہ سطریں کسی کہانی سے لی گئی ہیں، مگر یہاں میرا مقصد اس کہانی کا نام بتانا نہیں ہے اور یہ بتانا بھی نہیں کہ کس کیرکٹر نے یہ بات کس کیرکٹر سے کہی ہے اور قصہ کب کا اور کہاں کا ہے، بلکہ میں ان سطروں کے صرف تین لفظ لے کر اپنی بات آگے بڑھانا چاہتی ہوں، وہ تین لفظ وہی ہیں جن کے نیچے نشان لگا دیا گیا ہے یہ تینوں اصل میں مختلف آوازوں کے نام ہیں۔

فزکس کی پڑھائی میں بتایا جاتا ہے کہ بات کرنے پر جو تحریکیں اور جو ہیجانات خارج ہوتے ہیں اس سے اردگرد کے لوگوں کو آواز کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تحریک یا ہیجان ''تہیج'' (Stimulus) کہلاتا ہے اور یہ تجربہ ہمارے لئے عام ہے۔ بھلا تم میں سے کس نے بادل کی گرج، ندی نالوں کا شور اور چڑیوں چہکار نہیں سنی ہوگی، مگر یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ ایسی تحریکیں ہیں جن پر انسان کا اختیار نہیں، لیکن کچھ تحریکیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو انسان خود پیدا کر سکتا ہے۔ جیسے توپ کی گرج، بم کا دھماکہ، یہ ناخوشگوار تحریکیں ہیں جب کہ موسیقی کے راگ اور گانے خوشگوار تحریکیں۔

یقیناً یہاں تمہارے دماغ میں یہ بات آرہی ہوگی کہ آخر یہ تحریکیں کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آواز کی تحریک کا اخراج منھ کے سامنے کی یا متحرک جسم کے اردگرد کی ہوائی حرکت کا نتیجہ ہوتا ہے اور سننے والے کے کان کے داخلے پر ہوا میں بھی سنتے وقت ایک قسم کی حرکت پائی جاتی ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آواز پیدا کرنے والے اجسام ہمیشہ ہی متحرک حالت میں ہوتے ہیں اور اس حالت کو آگے پھیلنے کے لئے ایک لچکدار واسطہ کی ضرورت ہوتی ہے اور واسطہ میں اس حرکت کے آگے بڑھنے کی نوعیت جاننے کے لئے ہوا میں ارتعاش حرکت، آگے پیچھے کرنے والے جسم پر غور کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک الگ لمبی تفصیل ہے۔ یہاں اتنا ہی یاد رکھنا کافی ہے کہ ہوا میں ہلکی بھاری لہر باری باری سے آگے بڑھتی جاتی ہے، اس کو طولی موجیں (Longitudinal wares) کہا جاتا ہے۔ جب یہ کان کے پردے سے ٹکراتی ہے تو اس میں بھی اسی طرح کی ارتعاشی حرکت (Vibrational Motion) پیدا ہو جاتی ہے اور اس حرکت کے ارتسامات جب دماغ تک پہنچتے ہیں تو سننے کا احساس ہوتا ہے یعنی آواز سنائی دینے لگتی ہے، ورنہ یہ تجربہ تو تمہیں ہوگا ہی کہ امی ابو پکارتے رہتے ہیں اور تم کھیل میں مگن رہتے ہو یعنی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔

یہاں یہ مزیدار بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آواز کی ترسیل (Transmission) کے لئے تحرک جسم کے اردگرد کسی لچکدار واسطے کا ہونا ضروری ہے۔ فلکی اجسام میں طرح طرح کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں، مگر وہ زمین پر سنائی نہیں دیتے، اس لئے کہ خلا میں کوئی لچکدار مادہ نہیں ہوتا ہے۔ آواز کے ارسال کی قابلیت واسطے کی کثافت یعنی گدلے پن پر منحصر ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ریل کی پٹری کے پاس کھڑے ہوں تو ہمیں دور سے آنے والی گاری کی آواز سنائی نہیں دیتی، لیکن اُسی جگہ ہم پٹری پر کان رکھ دیں تو دور سے آنے والی ریل کے انجن کی حرکت کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آواز کی رفتار گیس کے مقابلے مائع (Liquid) میں چار گونہ اور ٹھوس میں سولہ گونہ ہوتی ہے اور پٹری بہر حال ٹھوس ہے۔ آواز کی ایک طبعی خصوصیت وہ ہے جس کو تعداد ارتعاش (Frequeney) کہتے ہیں اس کا اظہار سر (Tone) یا امتداد (Pitch) ہے۔ ایک عام صحت کا آدمی بیس سے بیس ہزار تعداد ارتعاش کے درمیان کی آواز سن سکتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ موسیقی سر میں ارتعاش (Oscillation) با قاعدہ مسلسل اور سادہ ہوتا ہے جب کہ شور (Noise) میں ارتعاش بے قاعدہ، پیچیدہ اور بس لمحہ بھر کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شور میں آواز سنائی نہیں دیتی جب کہ سنگیت کے درمیان گیت کے بول سنائی دے جاتے ہیں۔

امتداد، آواز کی اس خصوصیت کا نام ہے جس سے ہمارے لئے بھاری اور باریک آواز میں امتیاز کرنا ممکن ہوتا ہے۔ آواز کی ایک اور طبیعی خاصیت شدت بھی ہے جس سے آواز کی بلندی اور پستی واقع ہوتی ہے۔

آواز کی انتہائی شدت گمک (Resonance) یا زور دار دھماکہ کہلاتی ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا یا سنا ہوگا کہ دھماکہ اتنا تیز تھا کہ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ یہ بہت بلند گمک (Loud) کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ آواز کی ایک اور طبیعی خاصیت ''کیفیت'' (Timber) کہلاتی ہے۔ سارنگی، ہارمونیم اور بانسری سے آواز تو ایک ہی امتداد کے سر سے نکلتی ہے، لیکن آسانی سے اسے الگ الگ محسوس کرلیا جاتا ہے، کیوں کہ ان آلات سے ایک ہی بنیادی سر بلکہ اس کے ساتھ مضاعف سرتیاں (Overtones) بھی نکلتی ہیں جن کی تعداد ہر موسیقی کے لئے جداگانہ ہوتی ہے اور یہی کیفیت کا باعث بنتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ آواز کی موجوں میں نور کی موجوں کی طرح انعکاس (Reflection) انعطاف (Refraction) انکسار ( ) اور انجذاب (Absoraption) ہوتا ہے۔ انعکاس سے گونج (Echo) پیدا ہوتی ہے جس کا لحاظ عمارتی صوتیات جیسے مکان، لیکچر ہال اور سنگیت ہال وغیرہ بناتے وقت رکھا جاتا ہے۔

جب آواز کی موج کے روبرو کوئی رکاوٹ حائل ہو تو اس ''انکسار'' (Diffraction) کی وجہ سے وہ موج کناروں سے مڑکر دوسری طرف چلی جاتی ہے اِسی لئے کبھی آواز اِدھر ہوتی ہے اور لگتا ہے کہ اُدھر سے آرہی ہے۔

جب آواز کی موجوں کا تعداد ارتعاش بیس ہزار یعنی سماعت کی انتہا سے زیادہ ہوجاتا ہے تو یہ ''بالاصوتی'' آواز ایک عذاب بن جاتی ہے۔ کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ توانائی اور شدت زیادہ ہونے پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ آواز بندوقی روئی اور کپڑے میں آگ لگا دیتی ہے، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے کچھ ثانیہ تک اس کے زیر اثر آجائیں تو وہ مرجاتے ہیں اور بیمار اور کمزور دل انسان کے دل کی دھڑکن اچانک بند ہوجاتی ہے۔ نور کی شعاؤں کی طرح ان کی اشاعت ایک ہی سمت میں ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اس سے پانی کے جہاز اور آب دوز (پنڈوبی) کشتیوں کا جائے وقوع بھی معلوم ہوسکتا ہے اور زیر زمین تیل اور معدنیات کے ذخیروں کی موجودگی بھی دریافت کی جاسکتی ہے۔ بالاصوتی امواج سے علم طب میں بھی کام لیا جاتا ہے۔

آوازوں کی موجوں کی ریکارڈنگ عموماً تین طریقے سے ہوتی ہے۔ پہلا طریقہ میکانیکی، دوسرا طریقہ مناظری اور تیسرا طریقہ مقناطیسی کہلاتا ہے۔ پہلے طریقے میں موم کے قرص پر نشانات لے کر اس کو پلاسٹک یا لاک کے قرص پر اتارا جاتا ہے۔ دوسرے طریقے میں ضیا برقی خانہ (Photo Electric Coll) کے استعمال سے سنیما کے فلم پر نشانات لئے جاتے ہیں اور تیسرے طریقے میں پلاسٹک کی ٹیپ یا فولاد کے تار پر مقناطیسی اثرات حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ریکارڈ کی ہوئی آواز کو دوبار سنایا جاسکتا ہے جس کا نام باز حصول (Reproduetion) ہے۔ غرض کہ علم طبیعیات میں آواز کی دنیا بہت بڑی بھی ہے اور بہت دلچسپ سائنسی اور معلوماتی بھی۔ زبان وادب والے علم لسانیات میں صوتیات کے عنوان سے جو کچھ پڑھتے پڑھاتے ہیں وہ بھی اسی کا ایک خاص پہلو سے ایک خاص حصہ ہے۔ ❁❁

- ☆ انسان اگر عقل کو دبالے تو جانور ہوجائے اور اگر وہ اپنی خواہش کو دبالے تو فرشتہ بن جائے
- ☆ جن لوگوں کی امیدیں مختصر ہوتی ہیں انہیں مایوسی بھی کم سے کم ہوتی ہے اور اُن کے اعمال بھی زیادہ سے زیادہ درست رہتے ہیں
- ☆ جو میسر آئے اُس پر خدا کا شکر ادا کرو اور قناعت کرلو اور جو نہ ملے اُس پر صبر کرو اور مایوس نہ ہو
- ☆ دنیا کی عزت مال سے ہے اور آخرت کی عزت اعمال سے ہے
- ☆ جس شخص کا کام بڑا ہو وہی شخص اصل میں بڑا اور محترم ہے
- ☆ انسان کو ہمیشہ اس کے کردار واعمال کے آئینے میں دیکھو

پرویز اختر
Pathar Ki Masjid, Patna - 800006

یومِ جمہوریہ

پیارے بچو! ہمارے قومی تہوار کے دن عیسوی سال میں دوبار آتے ہیں، ایک بار آٹھویں مہینہ کی پندرہویں تاریخ کو جسے ہم سب ''یوم آزادی'' کہتے ہیں اور دوسری بار سال کے پہلے مہینہ کی چھبیس تاریخ کو جسے ''یوم جمہوریہ'' کہاجاتا ہے۔ لفظ ''جمہوریہ''، جمہور سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تمام، سب۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے، چنانچہ جب ''قول جمہور'' یا ''جمہور کی رائے'' کہاجاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، سبھوں کا قول یا سبھوں کی رائے۔ ایک دور تھا، انگریزوں کی غلامی اور سات سمندر پار والوں کی حکمرانی کا دور، جب عوام کے فیصلے کی کوئی قدر قیمت نہ تھی اور عام لوگوں کی بات، ملک کے عام باشندوں کی رائے کا کوئی تصور تک نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ دور گیا، اب ہمارا دیش آزاد ہے اور جمہوریت کے سائے میں پھل پھول رہا ہے۔

''جمہوریت'' اس نظام حکومت کا نام ہے جو عوام کے نمائندے چلاتے ہیں اور ''جمہوری'' اُس سلطنت کو کہا جاتا ہے جس میں عام لوگوں کے چنے ہوئے آدمی شریک حکومت ہوں۔ ایسی حکومت کا قانون ''جمہوری آئین'' کہلاتا ہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء آزاد وطن میں ہمارے اپنے بنائے ہوئے جمہوری دستور کے نفاذ کی تاریخ ہے، وہ جمعرات کا دن تھا اور ہجری کلینڈر کے حساب سے ۱۷ جمادی الاوّل ۱۳۶۹ھ۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے مالک ہیں اور ہم نے آزادی لینے کے ساتھ ساتھ اس نظام کو نہایت خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ نہ صرف سنبھال رکھا ہے بلکہ اسے مضبوط، مقبول اور مثالی بھی بنایا ہے۔ ہم بہر حال اپنے ملک کے لئے جمہوری آئینی ڈھانچے کی تشکیل و تعمیر اور اس کے گونا گوں فائدوں پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

یہ ہمارے لئے بہت ہی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آزادی کے ساتھ ہمیں جمہوریت کی بیش بہا نعمت ملی اور دنیا کی دیگر قوموں کی برادری میں ایک جدید قوم کی حیثیت سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا تحفہ لے کر شامل ہوئے۔ بیشک ہمارے رہنماؤں نے وطن کی آزادی کے بعد جو فیصلہ لیا تھا، وہ ہمارے قومی مزاج اور قومی پسند سے بالکل ہی ہم آہنگ اور اس کے عین مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ کوئی طاقت اُسے ہلا نہیں سکتی۔ جمہوریت پر یقین ہمارا بہت بڑا اور بہت ہی انمول قومی سرمایہ ہے۔

۲۶ جنوری کی تاریخ آتی ہے تو ملک کے طول وعرض میں ہر جگہ، شہر سے لے کر گاؤں تک یوم جمہوریہ کی رنگارنگ تقریبیں منعقد ہوتی ہیں، خاص طور سے اسکولوں، مدرسوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں تو جشن جمہوریہ کے پروگراموں کی بہار رہتی ہے اور یہ سب کچھ ضروری بھی ہے اور انسانی فطرت کے مطابق بھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ قومی تہوار کا دن ہے اور تہوار مذہبی ہو یا قومی، بہر حال اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا ہے کہ خوشی کا اظہار کیا جائے اور کچھ خاص اہتمام کیا جائے، مثلاً یوم جمہوریہ آیا ہے تو پرچم کشائی ہو، قومی ترانے گائے جائیں۔ مٹھائیاں بانٹی جائیں، طرح طرح کی سجاوٹ ہو اور ثقافتی پروگرام کا انعقاد ہو، بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جہاں ہم پورے جوش وخروش اور عقیدت واحترام کے ساتھ یہ سارے کام کریں، وہیں ہم یہ بھی عہد کریں کہ ملک وقوم کی ترقی اور آئین کی حفاظت کے لئے ہم کبھی اپنی ذمہ داریوں اور اپنی قربانیوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گے بلکہ ہمیشہ ہی تازہ عزم وحوصلے اور پوری سمجھداری کے ساتھ وہ سب کچھ کرتے رہیں گے جو عوام کے لئے ہو، عوام کے فائدے کے لئے ہو اور عوام کی فلاح وآسودگی اور ایک دوسرے کی ترقی کے لئے ہو۔ اس سمت میں سوچنے اور بڑھنے کا سب سے پہلا اور سب سے کامیاب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی پڑھائی پر دھیان دیں اور گھر سے لے کر باہر تک ہر جگہ اپنے بڑوں سے وہ باتیں سیکھتے رہیں جن سے زندگی سنبھلتی ہے اور ملک وقوم سے محبت کا سچا شعور بڑھتا ہے۔

نزہت پروین نزہت
Women's College, Hajipur, Vaishali - 844101

سعدؔی شیرازی

عزیز بچو! ہمیں پوری امید ہے کہ شیخ سعدؔی شیرازی کا نام تم نے ضرور سنا ہوگا۔ وہ ایران کے مایہ ناز شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں۔ ان کی فارسی کتابیں ''گلستاں'' اور ''بوستاں'' دنیا بھر میں شہرت رکھتی ہیں اور صرف مدرسوں میں نہیں بلکہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹیوں کے فارسی نصاب میں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ انہیں معلم اخلاق اور ان کی کتابوں کو ''کتاب الاخلاق'' کہا جاتا ہے۔ تھوڑے لفظوں میں زندگی کو سنوارنے والی بڑی سے بڑی بات کہہ دینے کا وہ مثالی ہنر رکھتے تھے اور سادہ زبان میں بلند سے بلند تر اور عمدہ سے عمدہ خیالات پیش کر دیتے تھے۔ کسی موضوع پر کیا لکھنا ہے اس کا خیال تو اکثر لکھنے والے رکھا ہی کرتے ہیں، مگر سعدؔی کے بارے میں مشہور ہے کہ کس موضوع پر کیا نہیں لکھنا ہے، اس بات کا بھی انہیں ہمیشہ اور پورا پورا خیال رہتا تھا۔

سعدؔی کا اصل نام شرف الدین، لقب مصلح اور تخلص سعدؔی تھا۔ وہ شیراز کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۱۸۴ء میں ہوئی اور سو برس سے زیادہ عمر پا کر ۱۲۹۱ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کا مزار دلکشا کے قریب پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور یہ جگہ اب اس نسبت سے ''سعدیہ'' کہلاتی ہے۔ شیخ کے والد کا نام عبداللہ شیرازی تھا۔ وہ بادشاہ اتابک سعد زنگی کے دربار سے وابستہ تھے۔ گھر دیندار تھا، اس لئے بچپن سے ہی سعدؔی روزہ نماز کے پابند تھے۔ چھوٹی سی عمر سے ہی عبادت، شب بیداری اور تلاوتِ قرآن کا انہیں بے حد شوق تھا۔

سعدؔی شیرازی اگر چہ کم سنی میں ہی باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے، لیکن ان کی ماں ان کی جوانی کے زمانے تک زندہ رہیں اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت پر پورا دھیان دیا۔ اُس زمانے کے مطابق ابتدائی تعلیم میں مہارت کے بعد، وہ بغداد کے ''مدرسہ نظامیہ'' میں داخل ہوئے اور وہاں علامہ ابن جوزی جیسے صاحب علم وفن اور اُس وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے مختلف علوم وفنون کا درس لیا۔

شیخ بچپن سے ہی نہ صرف بہت ذہین اور محنتی تھے بلکہ خوش بیانی اور حسن تقریر کے مالک تھے۔ اُن کی اِن خوبیوں کی وجہ سے مدرسہ نظامیہ کے بعض طالب علم ان سے حسد کرتے تھے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ شیخ نے اپنے استاد سے حاسدوں کی شکایت کی تو استاد نے فرمایا:

''وہ بھی اپنی عاقبت خراب کر رہے ہیں اور تم بھی۔ وہ رشک وحسد سے اور تم بدگوئی اور غیبت سے۔''

جب شیخ تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو دفتر کائنات کے مطالعہ کی ٹھانی اور سیاحی پر کمر بستہ ہو گئے اور تیس برس تک سیر وسیاحت کرتے رہے۔ شیخ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتے تھے۔ ہر طرح کی تکلیفیں جھیلتے، مگر اُف تک نہ کرتے۔ شیخ نے عرب، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ کا سفر کیا اور پا پیادہ کئی حج بھی کئے۔ انہیں ابن بطوطہ کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا سیاح کہا جاتا ہے۔

شیخ ''گلستاں'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے زمانے کی سختی کا کبھی شکوہ نہیں کیا، لیکن ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نہ میرے پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حال میں غمگین وتنگ دل کوفے کی جامع مسجد میں پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پڑا ہے جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں ہیں۔ اس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے۔

شیخ صبر وقناعت کے ساتھ ساتھ عزت نفس کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ شیخ کی تصانیف میں ''گلستان'' اور ''بوستان'' ایسی کتابیں ہیں کہ فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول نہیں۔ ان کتابوں کی بنیاد اخلاق ونصیحت پر رکھی گئی ہے۔

شیخ سعدؔی نے اگر چہ عربی اور فارسی قصیدے بھی لکھے اور

رخشاں ہاشمی
Shah Zubair Road, Rizwi Colony, Munger (Mob. 9304342562)

سردی کا موسم

موسم سردی کا پھر آیا
شال رضائی سویٹر لایا
ببلو تھرتھر کانپ رہا ہے
کمبل سے تن ڈھانپ رہا ہے
تاپ رہی ہے منی ہیٹر
پہنے ہوئے ہے ٹوپی مفلر
اس سردی میں کون نہائے
دیکھ کے پانی سب چلائے
دور بھگاتیں ممی سردی
پاپا کے سنگ پی کر کافی
ٹھنڈ سے بچو تم بھی بچنا
جیکٹ ٹراؤزر پہنے رہنا
گرم دودھ بھی پینا بچو
مستی سے پھر جینا بچو
خوب کرو اب موج اور مستی
ہوئی ہے اسکول میں چھٹی

❁❁❁

فارسی غزل اور رباعی میں بھی اپنے کمالات دکھائے، لیکن ان کے نام کو زندہ رکھنے والی وہی دو کتابیں ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا۔ سعدؔی نے ’’بوستاں‘‘ ۱۲۵۷ء میں اور ’’گلستاں‘‘ اس کے ایک سال بعد لکھا تھا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں لگ بھگ ساڑھے سات سو سال سے زیادہ پرانی ہیں، مگر ان کی مقبولیت اور افادیت آج بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ ان کتابوں میں شیخ نے اپنی ستر سالہ زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کا نچوڑ، حکایات اور مثنویات کی شکل میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ کتابیں صرف بڑوں کے لئے نہیں بلکہ بچوں کے لئے بھی خاص طور سے نہایت فائدہ مند ہیں۔ یہ کتابیں اگرچہ فارسی زبان میں ہیں، مگر دنیا کی بہت ساری زبانوں میں ان دونوں کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے۔ اردو میں بھی ’’گلستان‘‘ اور ’’بوستاں‘‘ ترجمہ کے ساتھ عام طور سے ملتی ہے۔

سعدؔی شیرازی کی یہ کتابیں کیا ہیں، حکمت ونصیحت کا سدا بہار گلدستہ ہیں۔ اِن میں شیخ کے ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ اور کارآمد اقوال موجود ہیں۔ ’’گلستاں‘‘ کے شروع میں ہی انہوں نے لکھا ہے کہ آدمی اللہ کے شکر کا حق کیسے ادا کرسکتا ہے کہ ایک سانس پر دو شکر واجب ہے، ایک سانس کے اندر سے باہر آنے کا اور دوسرا باہر سے اندر جانے کا۔ اسی طرح سعدؔی نے اپنے ایک شعر میں یہ مضمون بیان کیا ہے کہ آدم کی اولاد گویا ایک جسم کے مختلف اعضا ہیں، اس لئے کہ وہ ایک ہی جوہر یعنی مٹی سے بنے ہیں۔ سعدؔی نے اپنی کتابوں میں یہ بھی بتایا ہے کہ دشمن سے ہر وقت بچو اور دوست سے اُس وقت جب وہ تمہاری تعریف کرنے لگے اور یہ کہ جو شخص نصیحت نہیں سنتا ہے، آخر کار اسے ملامت سننا پڑتا ہے اور کمزوروں پر رحم نہ کھانے والا شہ زوروں سے مار کھاتا ہے۔ حریص یعنی لالچی آدمی ساری دنیا لے کر بھی بھوکا ہے اور تھوڑے پر صبر کرنے والا ایک روٹی سے بھی پیٹ بھر سکتا ہے۔ سعدؔی کی ’’گلستاں‘‘ میں آٹھ باب ہیں اور ’’بوستاں‘‘ میں دس باب جو منظوم حکایتوں پر مشتمل ہیں اور ان میں زندگی اور بندگی کے تعلق سے طرح طرح کے موضوعات پر آفاقی صداقتوں کا بیان ملتا ہے اور نصیحت کا ایسا انداز جو دلوں کو چھو لیتا ہے۔ ❁❁

غزل

مانوسؔ سہسرامی

ہائے کیا کیا سماں روح پرور لئے اپنے دامن میں برسات پھر آ گئی
کوک کوئل کی ، چشمے اُبلنے لگے ، اُودی اُودی گھٹا پھول برسا گئی
مسکراتی ہوئی دھوپ نکلی کبھی ،ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کبھی
نغمۂ موجِ آبِ رواں ہر طرف ،دَل کے دَل آئے بادل گھٹا چھا گئی
پھول پتوں سے آراستہ جھاڑیاں ، وہ مہکتی ہوئی کونپلیں وادیاں
جب بھی اُٹھی گھٹا جھومتی جھامتی ، سبز پوشاک صحرا کو پہنا گئی
وادئ سبز میں چاندنی کا سماں ، رات بھیگی ،خموشی کا عالم ہے یہ
آبشاروں کی لے ٹوٹتی ہی نہیں ، جیسے مانوسؔ دنیا کو نیند آ گئی

مانوسؔ سہسرامی ایک دیندارعلمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اُن کا اصل نام محمد الطاف حسین تھا، لیکن شعر و شاعری کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام مانوسؔ سہسرامی سے ہی مشہور ہوئے۔ مانوسؔ کے والد منشی اصغرحسین ابن دلاورحسین ایک تجارت پیشہ آدمی تھے اور مانوسؔ کی والدہ بی بی بتول بنت شیخ حیدرعلی ایک سرکاری اسکول میں معلّمہ تھیں۔ مانوسؔ کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۱۳ء بروز جمعہ اور جائے پیدائش آبائی مکان محلّہ چوکھنڈی سہسرام ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مانوسؔ نے ''نذیریہ اردو اسکول'' اور ''مدرسہ حسینیہ'' میں تعلیم پائی، لیکن دس بارہ سال کی عمر میں ہی گھر کی معاشی حالت بگڑ جانے کی وجہ سے ان کی تعلیم کا روایتی سلسلہ موقوف ہوگیا اور وہ مسلسل معاشی تنگی کے حصار میں ہی گھرے رہے۔ بیٹری سازی، مالاسازی، گھڑی سازی، قفل سازی اور قلم کی مرمت جیسے چھوٹے چھوٹے کاموں سے کسی طرح گھر کی ذمہ داری پوری کرتے رہے، لیکن انہیں فارغ البالی نہیں ملی، البتہ یہ ضرور ہوا کہ تلاشِ معاش میں عاصمؔ بہاری کی صحبت اور ایک نجیب آبادی خاندان کے علمی کتب خانہ سے فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر آ گئے۔ مانوسؔ کو قدرت نے کچھ خاص صلاحیتیں دی تھیں اور شاعری کا بہترین ذوق بخشا تھا، چنانچہ مجلسی فیضان، کتابوں کے مطالعے اور مستؔ سہسرامی، شفقؔ عماد پوری، عشرتؔ لکھنوی، جلیلؔ مانک پوری، سیمابؔ اکبرآبادی اور دلؔ شاہجہاں پوری جیسے اساتذۂ وقت سے مشورۂ سخن کے ساتھ وہ اپنی شاعری کا سفر آگے بڑھاتے رہے۔ مانوسؔ کے تین شعری مجموعے ''سازالم'' (۱۹۵۱ء) ''نقش ناتمام'' (۱۹۷۳ء) اور ''نالہ شب گیر'' (۱۹۸۱ء) ان کی حیات میں شائع ہوئے اور ''کلیات مانوسؔ'' کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ مانوسؔ کی وفات ۱۶/ربیع الاول ۱۴۰۲ھ/۱۳ جنوری ۱۹۸۲ء بروز چہار شنبہ ہوئی۔
مانوسؔ کی رحلت کے بعد نومبر ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر خالد سجاد کی کتاب ''مانوسؔ سہسرامی: شخص اور شاعر'' بھی اشاعت یافتہ ہے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 **January - 2024** **No. 01**

غلام سرور

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15